عورت

دیس دیس سے عورتوں کی منتخب کہانیاں



عورت

دیس دیس سے عورتوں کی منتخب کہانیاں

مشعل بکس

آر بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔54600' پاکستان

فہرست

تعارف

ہم اپنے آپ سے ہٹ کر جب بھی کچھ دیکھتے ہیں تو اکثر ہماری آنکھ مغرب پر ہی جا کر ٹکتی ہے ادب کے ترجموں کے معاملے میں بھی یہی حال ہے۔ اول تو ترجمے ہی بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں بھی وہ مغربی ادب کے ترجمے ہیں۔ اور ان میں عورتوں کی تحریروں کے تراجم تو شاید خال ہی ملیں۔ یہ کوشش خوب سے خوب تر کی ہوگی۔ لیکن وجہ کوئی بھی ہو ہم اپنے بہت قریب کی تخلیقی فضا سے بڑی حد تک غافل اور بے نیاز رہے ہیں۔ ایشیائی زبانوں کا ادب قدرتی طور پر ہماری زندگی سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی کے مسائل اور ان کا احساس بھی مشترک ہے اور جن تجربوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ بھی نامانوس نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ایشیائی ادب سے بہت کم ترجم کئے گئے۔ اردو کا مترجم اور قاری دونوں اس ادب کی چاشنی سے بے بہرہ رہے، جہاں زندگی کا آہنگ ان کے لئے یکسر اجنبی نہیں۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے لئے ادب سے موثر کوئی وسیلہ نہیں ایشیائی ادب یہ موقعہ فراہم کرتا ہے کہ جغرافیائی قرب کو ایک ذہنی قرب اور تخلیقی عمل کو ایک قدر مشترک بنایا جا سکے۔ ایشیا کے لوگ اس صورت سے ایک دوسرے کے قریب آ سکیں گے، اور انہیں اس بات کا بہتر شعور پیدا ہوگا کہ ان کے اپنے علاقے میں لوگوں کے مسائل کیا ہیں ان مسائل سے آگہی کے کیسے کیسے پیکر ہیں اور تجربے نے ان کے احساس کو کس طور تراشنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر ایشیا کی عورتوں کی زندگی کی نہج اپنے ہم

عصروں سے بے حد مماثل ہے۔ اور جب انہوں نے زندگی کو موضوع بنایا ہے تو ان کی کہانیوں کی حیاتی ساخت ہماری اپنی زندگی کی ہی تصویر معلوم ہوتی ہے یہ ترجمے ناواقفیت کے فاصلوں کو کم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی زندگی کا بہتر شعور پیدا کرتے ہیں۔ علاقائی یک جہتی کے لئے ان ترجموں کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ تخلیقی عمل زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور بڑا باریک بین ہوتا ہے۔ زندگی کس صورت سے کرب اور راحت میں تصویریں بناتی ہے، وہ اثر ان ترجموں کے حوالے سے ہی ہم تک پہنچ سکتا ہے۔

کہانی صرف دلچسپی اور چٹخارے کی چیز نہیں۔ بات کو اثر انگیز کرنے کی چیز ہے۔ لطف یہ ہے کہ کہانی اپنی پردہ داری میں زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ یہ زندگی کی سچی اور اصلی تصویر ہوتی ہے۔ کرداروں کے نام فرضی ہوتے ہیں، مگر وہ کردار جو کچھ دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں وہ خیالی نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی پر بیت رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے کہانی کے پردے میں زندگی دھڑکتی ہے۔ یہ کہانی جب ایک عورت لکھتی ہے تو اس کی نوعیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مردوں کی اس دنیا میں تو عورت کی ذات بھی بس ایک کہانی ہے۔ لیکن ایک تو عورت ہی سب سے پہلے کہانی سناتی آئی ہے، اور دوسرے اس کی حساس طبعیت اپنے ماحول اور اپنے مسئلوں کا ایک ایسا سچا شعور رکھتی ہے جو کسی صورت صرف ''عورت پن'' کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ جو صرف عورت ہونے کا ہی حصہ ہے۔ تیزی سے اس بدلتی ہوئی دنیا میں جہاں معاش، ضرورت اور وسیلوں کے درمیان زندگی مستقل ایک کشاکش میں گھری کھڑی ہے۔ عورت کیا ہے، کہاں ہے، وہ کیا کرنا چاہتی ہے، اسے کیا کرنا پڑتا ہے، وہ اپنے تجربوں کو کس طور پر محسوس کرتی ہے، وہ خود کو زندگی سے کس طرح نبرد آزما دیکھتی ہے، وہ زندگی کی پیکار میں شرکت کا کیا مفہوم جانتی ہے، امن اور جنگ دونوں حالتوں میں معاشروں میں، اور خاص طور پر ان معاشروں میں جو معاشی طور پر ناآسودہ ہیں، اور جہاں زندگی کا کافیرنگ رہتا ہے، وہاں عورت کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟ وہ کس کس انداز سے زندگی کو برتتی ہے، اور اس کا حوصلہ کس صورت سے رشتہ جاں کو استوار رکھتا ہے۔ وہ محبت سے کیونکر تقویت پاتی ہے، بےعزتی اس کی احساس کو کس طور پامال کرتی ہے اور غم برداشت کر لینے میں اس کی ہمت کتنی ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کس طرح اس کے دل کو سیراب کر دیتی ہیں، اس کے خواب کیا ہیں، وہ اپنے گرد و پیش سے کیا توقع رکھتی ہے، یہ اور اسی جیسے ہزاروں سوال ہیں جو اپنا جواب کہانی کے روپ میں پاتے ہیں۔ زیر

نظر کہانیاں بھی اسی احساس کی آئینہ دار ہیں کہ آج کی دنیا سے کسی طور غافل نہیں ہے۔کبھی یہ اس کا مقدر کہا گیا ہوگا کہ وہ آئینہ کے مقابل تصویر ہے، آج وہ زندگی کے مقابل ہے اور زندگی کی حرارت کو اس کی رگوں میں شعور اور آگہی بن کر دوڑتی ہے۔

ایشیا قریب کی پندرہ کہانیاں اس ترجمے میں شامل ہیں ان کہانیوں کا پس منظر مختلف ہے۔خوشحال اور ترقی یافتہ ملکوں کی کہانیاں بھی ہیں اور کم وسیلہ اور ترقی پذیر معاشروں کی بھی۔ اس لحاظ سے ہمارے ہم عصر ایشیا کی یہ بڑی ہمہ گیر تصویریں ہیں۔اور وہاں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی بھی۔اقتصادی کی بے رحم بھاگ دوڑ، اور صرف مادی وسیلوں سے زندگی معتبر کرنے کی کوشش نے عورت کی ذات پر کیا اثر ڈالا ہے، ہم ان کہانیوں میں اس کا گہرا احساس دیکھتے ہیں۔شہری زندگی کے تقاضوں نے عورت کی ذمہ داریوں کی نوعیت کس طور بدل ڈالی ہے اس کا صرف شعور ہی نہیں بلکہ کرب بھی ان کہانیوں میں موجود ہے۔ایشیا کی زرعی معاشرت میں عورتوں کی ذمہ داریاں اور تیزی سے اُبھرتی ہوئی صنعتی معاشرت میں ان سے تعلقات کس صورت سے عورت اور مرد دونوں کی زندگیوں کو بدل رہی ہیں، ان کہانیوں میں بڑی حد تک ظاہر ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کا موضوع زندگی کے کسی بھی پہلو سے تعلق رکھتا ہو، اپنی جگہ بڑا موزوں اور بھرپور ہے۔کہانی کی مصنف نے اپنے موضوع اور اپنے احساس دونوں کے ساتھ بے حد انصاف کیا ہے۔یہ کہانیاں اپنے ملکوں کی سفیر ہیں، اور ایسی سفیر جو مصلحتوں کی پابند نہیں، بلکہ حقیقتوں کی ترجمان ہیں۔

ان کہانیوں میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشوں کی جنگ کے ہاتھوں مٹنے کی کہانی بھی ہے۔اور یہ بھی کہ عورت کا وجود جان دار ہو کر بھی بے جان، بے وقعت اور بے آواز موجود ہے۔غربت، کسمپرسی اور بھوک کی تکلیف کا احساس ہے تو دوسری طرف آسائشوں کی خاطر کوکھ کرایہ پر دینے کی تصویر بھی۔انا اور عزت کا شدید تصور بھی ہے تو دوسری طرف انسان شناسی میں غلطی اور خطا کا غم بھی۔ایک طرف ذات کا کرب تو دوسری طرف شرافت ذہنی کا احساس، عورت ہونے کا کرب اور ممتا کی مجبوری و محرومی کہیں کہانی بنتی ہے تو کہیں مجبوریوں کی چوٹ اور مجبوری کا درد احساس ذات بن کر اُبھرتا ہے۔اس حوصلہ کی عکاسی بھی ہے جب زندگی کے بھید سمجھ میں آنے لگتے ہیں اور سطحی جذباتی لگاؤ سے اُٹھ کر ایک ارفع حیاتی سطح تک بلند ہونے کی فکر رہتی ہے تاکہ محبت میں حُسن اخلاق کی برتری ہے۔اور ایک طرف عورت اور مرد کی ایک دوسرے کے

لئے قدرتی کشش کی بھولی تصویر ہے تو دوسری طرف ایسی دانش بھی جہاں محبت کی بازیافت سے مطمئن ہونے اور مرنے کے بعد بھی جذبوں کو مستحکم رکھنے کی قوت ہو۔ زندگی کو قبول کر لینے اور اس سے حظ اٹھانے کا جذبہ بھی۔ شکایت کی بجائے شکر کر لینے کی صلاحیت، محرومیوں کا شکوہ کرنے کی بجائے جو خوشی بھی مل جائے اسے سرمایہ سمجھ لینے کا ظرف کہانی کے پردے میں ہم سے زندگی کی کہانی کہتا ہے۔ یہ کہانیاں جاپان، کوریا، ویت نام، ملائشیا، برما، چین، فلپائن اور تھائی لینڈ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم ان علاقوں کے لوگوں سے نسبتاً کم واقف ہیں۔ یہ کہانیاں ہمیں ان لوگوں کے قریب لے جاتی ہیں جن کی زندگی اور اس کی صورتیں بڑی حد تک ہماری طرح کی ہیں۔ بھارت کی قدآور مصنفہ امرتا پریتم بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ گو اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جنوبی ایشیا کی کہانیاں اور خاص طور پر عورتوں کی لکھی کہانیوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جائے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ترجمہ بے ساختہ اور رواں ہے۔ کہیں کہیں جو ذرا سی ناہمواری لگتی ہے، وہ زبان سے زیاں خیال کو منتقل کرنے کی مشکل ہے۔ اس سے خوبی یہ باقی رہی کہ ترجمے نے اصل کا مزہ نہیں کھویا اور خیال کی فکری رو کو قائم رہنے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ہاں یہ ترجمے سنجیدگی سے پڑھے جائیں گے، صرف نت نئی کہانیوں کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ ہمارے بہت پاس رہنے والے کس صورت سے زندگی کو برت رہے ہیں۔ اور انہیں اپنے اس برتاؤ کو تخلیقی عمل میں ڈھالنے کا کیا سلیقہ آتا ہے۔ مشعل کا ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے کہ انہوں نے تخلیقی قوتوں کے انجانے گوشوں کو تلاش کیا اور ہمیں روشنی دی۔

جیا پنگا ؤ
(عوامی جمہوریہ چین)

دو بہنیں

پچھلے موسمِ گرما میں گاؤں میں بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد میں اپنی خالہ جان سے ملی اور یہ جون کے مہینے میں ہوا۔ اِسی ماہ کی چھ تاریخ کو دہقان روایتی طور پر اپنے ملبوسات اور بستر کی چادریں وغیرہ دھوپ میں ڈالتے ہیں تا کہ وہ کیڑوں سے محفوظ رہیں۔ سفیدے کے درختوں کے درمیان بندھی رسی سے رنگا رنگ فرکوٹ، ریشمی رضائیاں، کھال کی چادریں اور اُونی جرابیں لٹک رہی تھیں۔ میں اُن کی طرف دیکھ رہی تھی کہ میرے کانوں میں کسی کی ہنسی کی آواز آئی۔ ایک درخت کی اوٹ میں ایک نوجوان لڑکی کچھ گیلے کپڑوں کو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ تہہ کر رہی تھی۔ وہ لڑکی اتنے زور سے کھینچتی تھی کہ ہر بار اُس کی ماں کو ایک دھکا سا لگتا تھا۔

''دیکھو۔۔۔۔۔۔ احتیاط کرو۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو، کپڑے کو اس طرح تو نہ کھینچو۔۔۔۔'' ماں نے ایت آمیز لہجے میں کہا۔ لڑکی ہنستی رہی اور بدستور زور سے کھینچتی رہی۔

''تم بہت شرارتی ہو۔'' اُس کی ماں نے سرزنش کی اور پھر یک دم کپڑے کو اتنے زور سے کھینچا کہ لڑکی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا سر چھوڑ دیا۔ اُس کی ماں پیچھے کو گرنے لگی۔ لڑکی بھاگ کر آگے ہوئی اور اپنی ماں کو تھام کر ہنسنے لگی اور اِس مرتبہ ماں بھی ہنسی میں شامل ہو گئی۔ یک

دم ماں نے اُسے چپ ہونے کے لئے کہا اور پھر ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا لڑکی خاموشی سے پنجوں کے بل چلتی ہوئی اُس کی طرف گئی لیکن غلط سے کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ زور سے جا لگی وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی اور چیخ کر کہنے لگی: ''تم باہر دُھوپ میں کیوں نہیں آتیں؟ کیا تم مُرجھا جاؤ گی!''

اسی لمحے میری خالہ نے مجھے دروازے کے سایے تلے کھڑے دیکھا اور میرے لیے چائے لے کر آ گئی۔ چنانچہ میں نے لڑکی کو بھی دعوت دی۔ اس نے دعوت قبول کر لی لیکن اُس کی ماں ناراض ہونے لگی۔

''لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟ یہی نا کہ اب میں اسے ''بہن'' کہہ کر بُلا لوں گی۔'' اُس نے سینہ تان کر کہا۔

''میری بھانجی ایک زرعی کالج میں بہت اچھی طالبہ ہے'' میری خالہ نے کہا، ''اور تم اِسے اُستانی کہو تو بہتر ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی اُس وقت کیا دیکھ رہی تھی۔

''میں اپنی ماں کے پالتو جانور کو دیکھ رہی ہوں۔'' اُس نے جواب دیا۔

میری خالہ نے بتایا کہ لڑکی کا نام کریسنٹ ہے اور کمرے کے اندر اُس کی بہن ہے جس کا نام مون ہے اور وہ بریگیڈ کے تحقیق گروپ کی ممبر ہے۔ وہ ایک تجربے میں مصروف تھی اس لیے کسی کو مخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

''وہ خاندان بھر کی لاڈلی ہے اس لیے ہمیں اُس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔'' کریسنٹ نے لب سکیڑ کر کہا۔

''اور تم؟'' میں نے اُسے چھیڑا۔ ''میں؟ مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کیا واقعی میری بھی کوئی ماں ہے؟''

ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہنس رہی تھی اور سب سے بلند آواز میں۔ اُس نے میرا تھیلا دیکھ کر اُس میں سے دو کتابیں نکال لیں۔ ''یہ کیا ہیں؟''

''انگیریزی کتابیں''۔ میں نے جواب دیا۔

''کیا تم اِنھیں سمجھ سکتی ہو؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں''۔ میری خالہ بول پڑیں۔ ''یہ تو پہروں اِنہیں پڑھتی رہتی ہے

اور پھر بھی تھکتی نہیں۔''

اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی بہن کے پاس بھی انگریزی کی کچھ کتابیں ہیں اگرچہ وہ اتنی بڑی بڑی نہیں ہیں۔ اُسے اپنی بہن کو پڑھتے ہوئے سننے کا بڑا شوق تھا لیکن اُسے اُس کے ہمراہ مطالعہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف اُس کی خوشی کی خاطر میں نے اپنی کتاب اُسے سنانی شروع کر دی۔ ابھی صرف آدھا صفحہ ہی ختم ہوا ہوگا وہ میدان کی طرف بھاگی کیونکہ وہاں ایک لڑکا پتھر کے رولر کے ساتھ سرکنڈوں کو کچل رہا تھا۔ وہ رولر کے اوپر چڑھ کر ہنسنے لگی۔

شام کو جڑی بوٹیوں کی ایک چینی دوائی کو گرم کرتے اور پڑھتے ہوئے میں نے دروازے کے ساتھ ایک آواز سنی۔ میں نے سوچا شاید تیز ہوا ہے اس لیے پروا نہ کی۔ دستک دوبارہ ہوئی۔

''کیا تم نے ابھی سونے کی تیاری نہیں کی، اُستانی لُو؟'' ایک آواز نے پوچھا۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔ دروازہ کھولا تو وہاں ایک شرمیلی لڑکی چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے اپنی چوٹیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

''میں مُون ہوں اور تمھارے سامنے والے کمرے میں رہتی ہوں۔ میں اتنی دیر سے تمھیں تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہوں۔''

میں ایک نئی دوست کو پا کر بے حد خوش ہوئی تھی چنانچہ میں نے اُسے خوش آمدید کہتے ہوئے بستر پر بیٹھنے کو کہا۔ ''تم اپنی بہن سے بالکل مختلف ہو۔'' میں نے اُسے بتایا اور ظاہر ہے میں کریسنٹ کا حوالہ دے رہی تھی۔

''ہم سب مختلف ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''اُس نے مجھے تمھارے بارے میں بتایا ہے اور کہا ہے کہ تم اپنے ہمراہ کچھ انگریزی کتابیں لائی ہو۔ تم یہاں کتنا عرصہ قیام کرو گی؟''

''تقریباً دس روز۔''

اِس سے زیادہ کیوں نہیں؟'' اُس نے ہوا میں دوائی کی بُو سونگھی تو کہنے لگی، ''کیا تم بیمار ہو!''

میں نے اُسے بتایا کہ معدے میں خرابی کے بعد میں یہاں اپنی صحت کی بحالی کی خاطر آئی ہوں۔

اُس نے منہ بنایا اور کہنے لگی: ''میں کل اپنے ہم جماعت شِنگ وِن کو خط لکھوں گی، وہ

اب ایک سنیاسی ڈاکٹر ہے۔ اُس کو علاج کا علم ہو گا۔ دراصل میں آج رات تمھارے پاس اس لیے آئی تھی کہ مجھے تمھاری مدد درکار ہے لیکن تم تو بیمار ہو۔۔۔۔۔۔۔'' اُس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور چمچ سے دوائی کو ہلانے لگی۔

اُس نے دوائی میں چمچہ چلانا بند کر دیا اور کہنے لگی: ''تم کیسے جانتی ہو؟''

''کریسنٹ نے مجھے بتایا تھا۔''

وہ ہنسنے لگی۔''میں گاؤں کی رہنے والی ہوں اور میرا خیال تھا مجھے انگریزی سیکھنے کی ضرورت نہیں لیکن جب میں نے تحقیقی کام شروع کیا تو مجھے اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ پھر میں نے اپنے آپ کچھ لفظ سیکھے اور پڑھنے لگی۔''

''کیا میں تمھاری مدد کر سکتی ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

وُہ بے حد خوش ہوئی۔ چنانچہ میں اُسے پڑھانے لگی۔ پھر اُس نے اپنی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا جس پر انگریزی الفاظ، گندم، جو، کلیاں اور زرگل لکھے ہوئے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ انہی الفاظ سے آغاز کرے اس لیے میں نے اُسے یہی لفظ پڑھنے سکھائے اور پھر اُس نے اُن کو اپنی کتاب میں لکھ لیا۔ اُدھر اُس نے اپنا آخری لفظ لکھا اور ادھر میری دوائی تیار ہو گئی اور اُس نے برتن اٹھا لیا حالانکہ وہ بہت گرم تھا۔ اُس نے جلدی سے اُسے میز پر رکھ دیا اور پھر اپنی جلی ہوئی انگلی پر پھونکیں مارنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے لیکن اُس نے سر کے بالوں میں سے ایک بال اکھاڑا اور سوئی میں ڈال کر انگلی پر اُبھرے آبلے میں پرو دیا۔

''اس کی خیر ہے۔ آبلہ اب سُوکھ جائے گا۔ کیا میں نے زرگل کا لفظ درست لکھا ہے!''

اُس کی لکھائی صاف ستھری تھی۔

جانے سے پیشتر اُس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اُسے روزانہ دو گھنٹے پڑھایا کروں گی اور ہر دوسرے دن اُس کا امتحان لوں گی۔ اُس نے کہا وہ دوائی گرم کرنے میں میری مدد کیا کرے گی۔

اگلے روز میں نے صُبح سویرے اُسے اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے سُنا اور میں ابھی بستر میں تھی۔ اُس نے بہت تیزی سے انگریزی سیکھی اور ہر لفظ، جو اُس نے سیکھا تھا، بڑی آسانی سے دہرانے لگی۔ رات کے دس بجے کریسنٹ ایک تعمیراتی ٹیم کے ساتھ کام کرنے کے بعد واپس لوٹتی لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ میرے پاس ضرور آتی۔ جونہی وہ میرے کمرے میں داخل ہوتی

میرا کمرہ قہقہوں سے بھر جاتا۔ جلد ہی میں اُس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی بے تکلف ہوگئی۔ لی سان ہُو ایک ایسا نڈر اور جانباز تھا جو بلند ترین درختوں پر چڑھنا پسند کرتا تھا اور دریاؤں میں چھلانگ لگا کر دیر تک پانی کے نیچے رہ سکتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ ٹیم کے لیے شہتیر اُٹھا کر لے جاتا یا دریا میں کیچڑ نکالتا۔ وہ مشکل کام کرنا پسند کرتا تھا۔ دوسرا لڑکا ذہانگ یونگ لڑکیوں سے بہت شرماتا تھا اس لیے اُسے ''جاگیردار'' کا لقب دیا گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اور کریسنٹ رسوں کی مدد سے ایک بھاری پتھر لے جارہے تھے۔ اُس نے چوری چھپے رسے کو اپنے نزدیک کرلیا چنانچہ کریسنٹ نے اعتراض کیا کہ وہ عورتوں کو کمتر درجے کی مخلوق سمجھتا ہے۔ اُسے اتنا دُکھ ہوا کہ وہ رونے لگا۔ پھر ایک لڑکی تھی جس کا نام بان فانگر تھا اور اُس کی زبان بڑی چلتی تھی۔ صرف کریسنٹ اسی سے ڈرتی تھی کیوں کہ اُس نے اسے ایک مرتبہ سب کے سامنے کُڑکُڑاتی مُرغی کہہ دیا تھا۔ کریسنٹ کا یہ نام پوری ٹیم میں بہت پسند کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد کریسنٹ کے قہقہوں اور لطیفوں کی وجہ سے مُون اپنے کمرے میں ہی بند رہنے لگی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو کریسنٹ'' اُس کی ماں نے ساتھ والے کمرے سے اُسے سرزنش کرتے ہوئے کہا ''تم ہمیشہ قہقہے لگاتی رہتی ہو اور ہر وقت کھی کھی کرتی رہتی ہو۔ جب میں تمھاری عُمر کی تھی۔'' اُس کی ماں نے بات جاری رکھی، ''میں سارا دن کام کاج میں مشغول رہتی تھی اور میں نے کبھی۔۔۔۔۔''

''تم جب میری عمر کی تھیں تو تمھارے پاس قہقہے لگانے کا کوئی جواز ہی نہ تھا لیکن میں ہنس سکتی ہوں اور میں خوش ہوں تو تم حسد کیوں محسوس کرتی ہو!''

''صرف اس لیے کہ میں نوجوان ہوں مجھے ہنسنا نہیں چاہیے؟''

اُس کی ماں جواب دینے سے قبل کھانسی۔ ''میرا مطلب ہے تمھیں اپنی بہن کی طرح ہونا چاہیے۔''

''نہیں، کبھی نہیں۔ اُس کو انگریزی سیکھنے کی ضرورت ہے لیکن مجھے نہیں۔ بہرحال میں سنجیدہ نہیں رہ سکتی۔ تم نے مجھے بندریا نہیں کہا تھا؟''

''کم ازکم تم اپنی بہن کی کچھ مدد تو کرسکتی ہو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد کریسنٹ کہنے لگی: ''تم درست کہتی ہو لیکن میں کیسے اُس کی مدد کروں؟''

میں اُسے کچھ مشورہ دینے والی تھی لیکن جب میں پانی کا ایک گلاس لے کر باورچی خانے سے واپس آئی تو میں نے اسے بستر پر گہری نیند میں سوتے پایا چنانچہ میں مُون کے پاس چلی گئی۔ اُس کے چھوٹے سے کمرے میں مرتبان، پیٹیاں اور مختلف اجناس کے بیجوں کی بوریاں بھری پڑی تھیں۔ اُس کی دیواروں پر پہاڑے، گراف، نقشے اور موسمی چارٹ لٹک رہے تھے۔ اُس کا سر دیوار کے ایک کونے میں دھنسا ہوا تھا اور وہ گندم کے بیج کو عدسے کی مدد سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے عین اُوپر ایک بلبل گندم کے ایک کھیت کے اُوپر پرواز کرتا دکھایا گیا تھا جو بہت اچھی فصل کی علامت تھا۔ ''کیا تم نے کوئی نئی قسم دریافت کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ذرا اُس کو دیکھو'' وہ ایک اضطرابی کیفیت میں کہنے لگی۔ ''اور تم اس کا کوئی نام رکھ دو''۔

اُس کی ہتھیلی میں گندم کا ایک بیج تھا۔ سبزی مائل اور عام قسم سے لمبائی میں کم از کم دگنا۔ یہ ایک مصنوعی قسم تھی۔ اس نے تین برس کے تجربوں کے بعد یہ قسم پیدا کی تھی۔ اس کی کامیابی پر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ دانے کے وزن سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عام گندم کی نسبت زیادہ آٹا دے سکتا تھا۔ میں اس سوچ میں تھی کہ آخر اُس نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف تحقیق کے لئے ہی کیوں وقف کر رکھی ہیں۔

''ہم اِسے ''کامیاب گندم'' کا نام کیوں نہ دے دیں؟'' میں نے تجویز پیش کی

''نہیں'' وہ مسکرائی۔ ''کامیابی ابھی بہت دور ہے اور اِس بیج میں ابھی کچھ خرابیاں ہیں۔ میں اسے مزید بہتر بنانا چاہتی ہوں۔ کیوں نہ ہم اسے بہتر گندم، کا نام دے دیں؟'' میں نے اتفاق کیا۔ میں جاننا چاہتی تھی وہ اس کے بعد کیا کرے گی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا گروپ اس بیج سے ایک نیا بیج بنانے کا خواہش مند ہے۔ اگر وہ مکمل طور پر کامیاب ہو گئے تو پھر اس کا نام' کامیاب گندم' رکھ دیا جائے گا۔ پچھلے چند دنوں کے دوران اُسے مختلف جگہوں سے زیادہ فصل دینے والی اقسام کے بیج وصول ہوئے تھے اور اُس نے انھیں مختلف کھیتوں میں بونے کا ارادہ کیا ہوا تھا تاکہ اُن کا موازنہ کیا جا سکے۔' وہ پہاڑ کے پار والے ایک بریگیڈ سے بھی کچھ بیج منگوانا چاہتے تھے لیکن اُن کے پاس کوئی ایسا فالتو شخص نہ تھا جو وہاں جا سکے۔

''تم کریسنٹ کو اس معاملے میں مدد کرنے کو کیوں نہیں کہتیں؟'' میں نے مشورہ دیا۔

''نہیں، وہ بے حد غیر ذمہ دار ہے۔''

''میں اُس کے ہمراہ جاسکتی ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ اپنی فصل اب کیوں کاشت کر رہے ہیں جب کہ تم کاشت ختم بھی کر چکی ہو۔

چنانچہ اگلی صبح کریسنٹ اور میں نے دریا عبور کیا اور دیکھا کہ پہاڑ کے پیچھے دہقان ابھی فصل کاشت کر رہے ہیں۔ میں نے پُوچھا کہ کاشت میں اتنا فرق کیوں ہے؟'' میں قہقے لگانا کیوں پسند کرتی ہوں؟'' اس نے جواب دیا۔

میں اُس بے تکے جواب سے بوکھلا گئی۔

''تمھیں اس بارے میں میری بہن سے پوچھنا چاہیے۔'' وہ ہنسنے لگی۔'' میں تو تمہیں بند باندھنے، کھیتوں میں ہل چلانے، پتھر توڑنے اور پہاڑوں کو بارود سے اُڑانے کے بارے میں بتا سکتی ہوں''۔

بریگیڈ کے لیڈروں کی اجازت سے ہم گندم کے کھیتوں میں بیج چننے کے لیے چلی گئیں۔ ہم نے پانچ لمبے قد کے پودے چُنے جن کی بالیاں لمبی اور بیجوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جب ہم گھر پہنچیں تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ کریسنٹ گندم کی بالیوں کو مسلتے ہوئے کہنے لگی کہ اب میری بہن مجھے ایک ایسی بیوقوف لڑکی نہیں کہے گی جو سارا دن صرف قہقے لگاتی رہتی ہے۔

''کیا وہ تم سے پیار کرتی ہے؟'' میں نے یک دم پُوچھا

''کبھی کبھار۔'' اُس نے جواب دیا'' لیکن میرا خیال ہے کہ اُسے سائنس سے زیادہ پیار ہے''۔

''کیوں؟''

''اپنے نظریات کی وجہ سے۔''

''کیا مطلب؟''

'ڈاژہائی، زراعت میں ایک مثالی ترقی یافتہ بریگیڈ سمجھا جاتا ہے اور ہمارا بریگیڈ اس سے سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اُمید ہے کہ اگلے دو برسوں میں وہ بھی ڈاژہائی بریگیڈ کی طرح ترقی کر جائے گا۔''

کیا شاندار منصوبہ ہے۔ میں نے نیلے آسمان کی جانب دیکھا اور پھر سڑک کے دونوں طرف چل پڑے گندم کے گٹھوں کو، جن میں سے گندم نکالی جاتی تھی، اور بریگیڈ کے اراکین ترازو پر اُن کا وزن کر رہے تھے اور اُن میں سے ایک بلند آواز میں وزن بتاتا جاتا تھا۔ جونہی

ہم پُل پر پہنچے، کرینٹ نے مجھے پُل کے ذریعے پار جانے کو کہا جب کہ وہ خود جوتے اتار کر دریا میں اُتر گئی۔ وہ کھی کھی کرتی پانی اُڑاتی بھاگنے لگی اور اس کا گلابی بلاؤز کنول کے پھول کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ میں نے اسے احتیاط سے چلنے کو کہا لیکن وہ زیادہ تیز بھاگنے لگی اور پھر وہ ٹھوکر کھا کر گری اور پانی کے اندر چلی گئی۔ ؤہ پانی کی سطح پر اُبھری اور پھر نیچے چلی گئی کیونکہ ؤہ گندم کی اُن بالیوں کو پکڑنا چاہتی تھی جو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھیں۔ اِس خدشے سے کہ کہیں اُسے کچھ ہو نہ جائے میں نے اُسے کہا کہ وہ بالیوں کے بارے میں تردد نہ کرے لیکن اُس نے میری بات پر دھیان نہ دیا۔ آخر کار اسے ایک بالی مل گئی۔

پانی سے نکل کر اس نے اپنے آپ کو کنارے پر گرا دیا اور رونے لگی۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ کم از کم اُس کے پاس ایک بالی تو ہے، اور جو گم ہو چکی ہیں۔ اُن کے لیے رونا تو حماقت ہے۔ اُس نے رونا بند کر دیا اور یہ کہہ کر کہ ''آپ یہاں آرام کریں'' وہ دریا کی طرف بھاگتی گئی اور پانی میں سے پانچ کیکڑے ڈھونڈ کر لائی۔

''دیکھا میں اپنی بہن کی طرح نہیں ہوں'' وہ پھر ہنسنے لگی ''لیکن میں گندم کی بالیوں کا نقصان ان کیکڑوں سے پورا کر دوں گی________ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کیا خیال ہے؟''

اس شب جب میں بستر میں لیٹ چکی تھی مجھے سسکیوں کی آواز آئی۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں باہر آئی لیکن صحن ویران پڑا تھا لیکن اس جگہ جہاں میں نے کرینٹ اور اس کی ماں کو پہلی بار کپڑے لپیٹتے دیکھا تھا وہاں ایک درخت کے سائے تلے میں نے کرینٹ کو روتے ہوئے دیکھا۔ اس کے کندھے ہل رہے تھے۔ مون نے اسے بالیوں کے گم ہونے پر ڈانٹا تھا اور غصے میں ان کیکڑوں کو بھی پھینک دیا تھا۔

''وہ ہمیشہ مجھ پر غیر ذمہ دار ہونے کا الزام دھرتی ہے اور اب وہ مجھے بولنے بھی تو نہیں دیتی'' کرینٹ نے شکایت کی۔

تمھیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ گندم کی اس قسم کو کتنی شدت سے حاصل کرنا چاہتی تھی''۔

''میری سمجھ میں تو نہیں آتا________ بیج اتنے قیمتی کیوں ہیں؟ اگر ہم انہیں اس برس کاشت نہیں کر سکے تو اگلے برس کر لیں گے''۔

''لیکن اس طرح تو وقت ضائع ہوتا ہے۔ جتنی جلدی یہ تجربے مکمل ہو جائیں اتنی جلدی نئی اقسام متعارف ہوں گی اور اس کا مطلب ہے زیادہ گندم''۔

یہ احساس کرتے ہوئے کہ یہ کام کتنا اہم تھا وہ میرے ساتھ آ لگی اور بڑے راز دارانہ لہجے میں بولی ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب قہقے نہیں لگایا کروں گی______تم دیکھ لینا، ایسا ہی ہوگا''

''بیوقوف مت بنو'' میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی ''انسان قہقے کیوں نہ لگائے؟ تمہاری بہن یہ تو نہیں چاہتی کہ تم سارا دن منہ پھیلائے بیٹھی رہو، وہ تو صرف یہ خواہش کرتی ہے کہ تم میں احساس ذمہ داری زیادہ ہو''۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں اسے سمجھ نہیں سکی تھی''۔

اس کو بھینچتے ہوئے میں نے اس کی معصومیت اور سنہرے دل کو محسوس کیا۔

''کیا میں احمق ہوں؟''

''بالکل نہیں'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں پہروں کسی بات پر سنجیدگی سے غور کرسکتی ہوں جس طرح کہ میری بہن کرسکتی ہے؟''

''ظاہر ہے''

''کیا تم مجھے سروے کرنا سکھاؤ گی؟ ہماری بریگیڈ اپنے کھیتوں کو بہتر بنانا چاہتی ہے اور وہ مدد کرنے کے لئے کہتے ہیں لیکن میں کچھ خوفزدہ ہوں_____''

مجھے کھیتوں کی لمبائی چوڑائی اور سروے کرنے کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہ تھا لیکن میں نے وعدہ کیا کہ میں اس موضوع پر اسے چند کتابیں خرید دوں گی، جب بھی میں قصبے کی جانب گئی_________وہ ابھی تک رو رہی تھی لیکن اس نے اب کچھ بہتر محسوس کیا۔ پھر مجھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کرینٹ نے بتایا کہ یہ مُون ہے اور جلد ہی ہم اسے انگریزی الفاظ دہراتے ہوئے سن لیا۔

مؤن نے بتایا کہ بریگیڈ کے دفتر نے اسے صوبائی صدر مقام میں منعقد ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کہا تھا اور وہ اگلی صبح وہاں جارہی ہے۔

طلوع آفتاب کے بعد ہم مُون کو بسوں کے اڈے پر چھوڑ آئے_____اس کے بعد ہر روز کرینٹ صبح سویرے اٹھ جاتی۔ میں اُسے اکثر اپنی کھڑکی میں دیکھتی۔ وہ انگوری کی ایک بیل کے نیچے کھڑی کنویں کے قریب حساب کا کوئی فارمولا یاد کررہی ہوتی۔ دوسرے لوگ

جب بیدار ہوتے تو وہ صحن کی صفائی میں مشغول دکھائی دیتی ۔ کام کاج ختم کرنے کے بعد شام کو میرے پاس آ جاتی اور اپنی مشکلیں بیان کر کے ان کے حل دریافت کرتی_____ وہ مون سے زیادہ ہوشیار تھی ۔ جب کبھی وہ کوئی حل تلاش کرتی تو پھر اس کی تفصیل میں جاتی کہ یہ کیسے ممکن ہے وہ ہمیشہ مطمئن اور خوش واپس جاتی ۔

جس روز مجھے اپنے کالج واپس جانا تھا میری خالہ جان اور کریسنٹ کی ماں میرے ہمراہ گاؤں کے باہر تک گئیں ۔ کریسنٹ پتہ نہیں کہاں تھی اور اس کی ماں بتا رہی تھی کہ دراصل وہ کام پر چلی گئی ہے اور اسے لانے کے لئے کسی کو روانہ کیا گیا ہے ۔ سٹیشن کی طرف روانگی سے میں اُداس ہو رہی تھی ۔ جونہی میں وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ کریسنٹ پسینے میں بھیگی میری جانب بھاگی چلی آ رہی ہے ۔

''کاش تم ہمیشہ کے لئے یہاں رہ جاتیں'' وہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہہ رہی تھی ''اور مجھے محنت سے پڑھنے کا حوصلہ دیتیں اور زیادہ ترقی کرنے کے لئے میری ہمت بندھاتیں''۔

''جونہی مجھے چھٹیاں ہوئیں میں واپس آ جاؤں گی اور جونہی میں اپنے قصبے میں پہنچوں گی میں وہ نصابی کتابیں تمہیں بھیج دوں گی''۔

یکدم مجھے یاد آیا۔ میں نے اپنے تھیلے میں سے انگریزی کی نصابی کتابیں نکالیں اور کریسنٹ سے کہا کہ وہ انہیں مُون کے حوالے کر دے ۔

''بہت بہت شکریہ_____ اگلے برس ہم تمہیں اپنی'' کامیاب گندم'' دکھائیں گے''۔

جب میں قصبے میں تھی تو ایک روز ایک ٹرام میں اتفاقاً مُون سے ملاقات ہو گئی ۔ وہ ایک انگریزی چینی کتاب پکڑے ہوئے تھی اور اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کانفرنس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان کے تجربے کی روشنی میں وہ اپنی تحقیق کے کام کو تیز تر کر دے گی ۔

''کیا خیال ہے تم کب تک کامیاب ہو جاؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ایک برس میں نہیں تو زیادہ سے زیادہ دو برس میں'' اور پھر انگریزی زبان میں کہنے لگی'' راستے کی مشکلات کے باوجود میں یقینی طور پر کامیاب ہو جاؤں گی''۔

زاوگی (واتھن بان)
برما

اُس کی بیوی

(۱)

ماپا، کوہسن کی بیوی، منڈی میں کام کرتی تھی۔ ہر صبح ٹرے پر سبزیاں سجائے وہ ایک میل پیدل چل کر شہر پہنچتی۔ اگر کاروبار تیز ہوتا تو وہ دوپہر تک واپس آجاتی ورنہ شام تک وہیں رہتی۔ جب بھی وہ واپسی پر بانس سے بنے ہوئے اُس پُل کے قریب پہنچتی جو گاؤں کے قریب ندی پر واقع تھا تو اُس کو اپنے خاوند اور بچوں کا خیال آنے لگتا۔ وہ دراز قد تھی اور اُس کے بال سُرخی مائل تھے۔ اُس کے دانت تھوڑے سے باہر کو نکلے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ بدصورت ہے۔ اُس کا خاوند کوہسن ایک آرام طلب شخص تھا جو گھر میں بیٹھا کھاتا پیتا رہتا۔ یہ تو درست نہیں کہ وہ بالکل ہڈحرام تھا کیونکہ وہ چاول پکاتا اور بچوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

کوہسن مہاتمابدھ کے راہبانہ سلسلے میں ایک نوآموز کی حیثیت سے نو برس گزار چکا

تھا، چنانچہ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ وہ طبعیت کا بہت اچھا اور ہنسنے ہنسانے کا شوقین تھا اسی لیے شادیوں اور خیراتی محفلوں میں آگے آگے ہوتا۔ وہ اپنی بیوی جتنا دراز قد نہیں تھا۔ اُس کی چھاتی چھوٹی، بال گھنے اور ہونٹوں پر ایک پتلی مُونچھ تھی۔

جب اُن کی شادی ہوئی اور پھر ایک بیٹا پیدا ہوا، ماپا نے دکان کا خیال رکھنا شروع کر دیا اور علاوہ ازیں کوہسن کی ضروریات کو بھی پورا کرنے لگی۔ جب دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو پھر اُس کے پاس صرف دکان کے لیے وقت رہ گیا اور بیٹی کی پیدائش کے بعد تو ماپا بہت ہی تھک جاتی۔ ایک مرتبہ جب اُسے کاروبار میں خاصا گھاٹا برداشت کرنا پڑا تو اُس پر ترس آتا تھا لیکن اُس کے لبوں پر شکایت کا ایک لفظ نہ آیا

جب کبھی اُس کی کوئی سہیلی کہتی: ''تم ذرا اپنے خاوند کو مہاتما بدھ کی توصیف کرتے اور اُس کی برکتوں کا بیان کرتے ہوئے گاؤں کی ایک شادی میں سنتیں: بہت ہی شاندار۔۔۔۔ وہ بہت ہی عالم فاضل شخص ہے۔'' تو اُس وقت وہ بے حد فخر محسوس کرتی۔ جب اُس کا چودہ سالہ بیٹا بانس کے پُل پر آکر اُس سے بھاری ٹوکری اور ٹرے لے کر خود اٹھا لیتا تو اسے بے حد خوشی ہوتی۔ اِن لمحات میں وہ اپنے خاوند کے لیے جذبہ تشکر سے لبریز ہو جاتی۔ ایک مرتبہ جب وہ اور اُس کے بچے گھر کی چھت پر تھے تو شراب کے نشے میں دھت ایک شخص نے سڑک پر کھڑے ہو کر واہیات قسم کے اشارے کیے بچے خوفزدہ ہو کر گھر کے اندر بھاگ گئے۔ کوہسن جلدی سے باہر آیا اور آستینیں چڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ شرابی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور پھر وہ ڈگمگاتا ہوا چلا گیا۔ ماپا بے حد شکرگزار ہوئی۔ اُس نے سوچا اگر میرا خاوند نہ ہوتا تو ہماری کتنی بے عزتی ہوتی!

ماپا اب اپنے سینتیسویں برس میں تھی۔ کوہسن اُس سے چھ برس بڑا تھا۔ کوہسن اگرچہ اتنا بڑا ہو گیا تھا لیکن آج تک اُس نے سچ مچ کوئی کام کر کے نہیں دیا تھا۔ جب لوگ کہتے کہ وہ اپنا توازن بیوی کے لباس کا کونہ تھام کر قائم رکھتا ہے تو وُہ مذاق سے کہتا: ''میں اپنے شاندار کارناموں کی وجہ سے اب آرام کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا ہوں : تم حسد نہ کرو۔''

اگرچہ انھیں وہ یہی کہتا لیکن دل ہی دل میں اُسے دُکھ ہوتا۔ لیکن جلد ہی وہ اس دُکھ کو بھول جاتا اور اُس کا جواب سن کر دوسرے لوگ منہ بنا کر بدتمیزی سے اپنی ٹھوڑی آگے کر دیتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے ہمسایوں کی ایسی باتیں سُن کر ذرا گرمی کھا گیا۔ اُس نے ایک چچازاد سے کچھ رقم ادھار لی اور بانس کے کاروبار میں شریک ہو گیا۔ لیکن اسے بہت گھاٹا پڑا اگلی بارشوں میں وہ ہل چلانے

کے لیے کھیتوں میں گیا۔ وہ گھر واپس آیا تو اُس کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس پر ہل کا پھالا لگ گیا تھا۔ زخم کے بھرنے میں پورے پندرہ دن لگے۔

(۲)

جس روز وہ ٹھیک ہوا وہ تینتالیس برس کا ہو چکا تھا۔ بدن کا زخم تو بھر گیا لیکن دل کا زخم ابھی ہرا تھا۔

ماپا حسبِ معمول منڈی جا چکی تھی۔ سب سے بڑا بیٹا راہبوں کے سکول جا چکا تھا۔ باقی دونوں بچے گھر کے سامنے املی کے درخت تلے کھیل رہے تھے۔ کوہسن سبز چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ اُس نے چھ بچوں کے باپ کو ایک بڑھئی کو اوزاروں والے بکس کے ساتھ برابر کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ اُس کا ایک ہمسایہ ندی پار دانی کے پتے کاٹنے گیا۔ یہاں تک کہ سامنے کے گھر میں رہنے والے بوڑھے نے بھی لکڑی کے ایک ٹکڑے کو چاقو سے کاٹا اور کیچڑ میں چلنے کے لیے چھڑی بنانے لگا۔

پہلے پہل تو کوہسن آرام اور سکھ چین سے چائے کے ایک پیالے کے بعد دوسرا پیالہ پیے چلا جا رہا تھا اور بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن جب اُس کے ہمسائے کام کاج کے لیے حرکت میں آئے تو اُس کا یہ سکھ چین دُھندلا گیا اور اُسے یاد آ گیا کہ ابھی تو اُس نے چاولوں والا برتن چولہے پر رکھنا ہے۔ یک لخت اُسے ہمسایوں کے طعنے یاد آنے لگے اور اپنی ساری زندگی اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی: راہب خانہ چھوڑنے کے بعد اُس کی سستی، ماپا کے ساتھ اُس کی شادی، اُس کا روباری ناکامی، اُس کا زخمی پاؤں۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ تھا اور اداسی اُس کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ اس قسم کی زندگی سے چھٹکارا پا جائے۔ اُس نے سوچا کہ راہب بن جانا چاہیے۔ یوں اُسے چاول نہیں اُبالنے پڑیں گے۔ وہ اپنی آنکھیں اچھائی کی معراج کی جانب موڑ دے گا۔ اُس کی بیوی اور بچے اُس کی وجہ سے عزت پائیں گے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ دوبارہ پیدائش دکھوں سے آزادی کا لمحہ قریب آ گیا ہے۔ وہ خود ایک چھوٹا سا دیوتا بن جائے گا۔۔۔۔۔۔۔اور یوں وہ سوچتا رہا لیکن اُسے پھر یاد آ گیا کہ اُسے چاول بنانے ہیں ورنہ کھانے کو کچھ نہ ہو گا اور بچے شور مچائیں گے۔ وہ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔

اس دوران منڈی میں ماپا اپنی سبزیوں پر پانی چھڑک رہی تھی تاکہ اُن کا وزن زیادہ ہو جائے اور اُس کی آمدنی بڑھ جائے۔ اِس زاید آمدنی سے وُہ اپنے خاوند کے لیے سِگار خریدنا چاہتی تھی۔

کوہسن چاول اُبالنے میں بہت ماہر تھا۔ اُس نے بچوں کو بلا کر اُنھیں کل کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ چاول دیے۔ جب بچے واپس جا کر کھیلنے لگے تو وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا اور پھر سے خیالوں میں گُم ہو گیا۔

جب وہ راہب بن جائے گا تو ہر صبح وہ اپنے کشکول کے ساتھ بھیک مانگنے کے لیے ماپا کے گھر آیا کرے گا اور یوُں ماپا اور بچوں سے مل لیا کرے گا۔ لیکن ماپا بالکل ان پڑھ تھی اور مذہبی قانون کے بارے میں لاعلم تھی۔ جب وہ مرے گی تو نچلے طبقوں میں چلی جائے گی۔ اسے اپنی بیوی پر ترس آتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اُسے مذہبی قانون کے بارے میں کچھ علم ہو جائے۔

بچوں کے جھگڑے کے شور نے اُسے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ بہن نے اپنے بھائی کو ناخن مارے تھے اور اُس نے بدلہ لینے کے لیے اُس کے بال نوچے تھے اور اب دونوں رو رہے تھے۔

کوہسن نے بچوں کو گھر کے اندر بلایا اور اُنھیں کمرے کے مختلف کونوں میں بٹھا دیا۔ اب اُس نے اپنے خواب میں واپس جانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اُس نے بچوں کی طرف دیکھا ان کے سَر نیند کے بوجھ سے جُھوم رہے تھے۔ اُس کے اندر بھی ایک جمائی نے انگڑائی لی۔

''یہاں سے ہلنا نہیں۔'' اُس نے بچوں کو حکم دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جونہی اُس کی آنکھیں بند ہوئیں بچوں کی آنکھیں کُھل گئیں۔ اُنھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور پھر اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ جونہی وہ سو جائے گا ہم باہر جا کر کھیلنے لگیں گے۔

کوہسن کی آنکھ کُھلی تو ماپا املی کے درخت تلے اپنے بیٹے کو بُلا رہی تھی: ''فوراً نیچے اُتر آؤ ورنہ گر جاؤ گے۔ تمھاری بہن کہاں ہے؟''

''کوہسن۔'' ماپا نے چیخ کر کہا۔ ''کیا تم اپنے بچوں کی رکھوالی بھی نہیں کر سکتے۔ تم کس قسم کے باپ ہو؟'' لڑکا درخت سے نیچے اُتر آیا اور جب بیٹی واپس آئی تو اُس کے ہاتھ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے تھے۔ کوہسن نے قہر بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی ماں کے

پیچھے چُھپ گئے۔

''یہ سگار تمھارے لیے ہیں۔'' ماپا نے کہا اور بچوں کو باورچی خانے میں لے گئی۔

کوہسن اُنھیں دیکھتا رہا۔ ماپا نے لڑکی کے ہاتھ دھلوائے اور اُنھیں کھانے کے لیے مٹر کیک دیے۔ پھر وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں اور سر جھکا کر بال کھول دیے اور یوں اُس کے بال اس کی ٹانگوں کے اُوپر لٹکنے لگے۔

''اپنی کُہنیوں کے ساتھ میری کمر پر مالش کرو۔'' اُس نے بیٹے سے کہا۔ اُس نے اپنا کیک دانتوں تلے دبا لیا اور مالش کرنے لگا۔ کُہنیوں کے زور سے اُس کی کمر جُھولنے سے لہرانے لگی اور کھلے بال سر کے جُھومنے سے لہرانے لگے۔۔۔۔ لگتا تھا ماپا پر آسیب آ گیا ہے۔ کوہسن نے دیکھا اور ناپسندیدگی کا ایک گہرا سانس لیا۔ اب مجھے راہبوں والا پیلا چوغہ پہن لینا چاہیے۔ اُس نے سوچا۔

لیکن اُس نے اپنی بیوی کو اس بارے میں سال کے آخر تک کچھ نہ بتایا۔۔۔۔۔۔۔

کیونکہ وہ اُس سے ڈرتا تھا۔

(۳)

تین ماہ بیت چکے تھے۔ حالانکہ کوہسن نے کہا تھا وہ پیلا چوغہ صرف ایک ماہ کے لیے زیب تن کرے گا۔ ماپا کی خالہ، جو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آئی ہوئی تھی، اب اپنے بچوں کے بارے میں اداس ہو رہی تھی جو اُس کے اپنے گاؤں میں تھے۔

''تجرد کی زندگی گزارنے والا کب واپس آئے گا؟'' ایک روز اُس نے راہب سے دریافت کیا۔ راہب نے جواب دینے کی بجائے ایسی مقدس سطروں کا حوالہ دیا جن میں راہب کی زندگی کی برکتیں بیان کی گئی تھیں۔ یہ مقدس سطور خالہ کے کانوں کو سنائی نہ دیں۔ اُسے صرف غصہ آ رہا تھا کہ اُسے یہاں روک کر زیادتی کی جا رہی تھی۔ جب راہب چلا گیا تو خالہ نے ماپا کو بُلایا:

''ماپا، میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ اپنے راہب کو کہو کہ چوغہ اُتار دے۔ میں ایک نوکرانی کی طرح تمھارے گھر نہیں رہوں گی۔'' اُس نے دھمکی دی۔ ماپا خود بھی یہی چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند گھر واپس آ جائے۔ اُس نے ایک دو مرتبہ موضوع چھیڑا تھا لیکن اس کے جواب میں

اُسے کچھ مقدس الفاظ سننے پڑے تھے۔ اب وہ وقت آن پہنچا تھا جب راہب تین ماہ کے لیے روپوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے چنانچہ اُس نے ایک سہیلی کے ساتھ مشورہ کیا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

وہ صبح دُھوپ کی وجہ سے اچھی لگ رہی تھی۔ املی کے درخت میں فاختائیں کوک رہی تھیں۔ ماپا منڈی جانے کے بجائے گھر پر ہی ٹھہری رہی اور اُس نے کھانا پکایا۔ پھر اُس نے غسل کیا اور پاؤں کے انگوٹھوں تک مہکنے لگی۔ اُس نے بکھری ہوئی لٹوں کو اس طرح باندھا کہ اُس کے نین نقش نکھر گئے۔ ماتھے پر بکھرے ہوئے چند بالوں کو اُس نے ''فاختہ کے پروں'' ایسے انداز میں سجایا۔ اُس نے اپنی بھنووں کو پنسل سے گہرا کیا اور پان چبا کر اپنے ہونٹ خوب سُرخ کر لیے اُس نے سُرخ پھولوں والا ایک سکرٹ پہنا اور اُس پر سفید کپڑے کی جیکٹ زیبِ تن کی۔ بچوں نے بھی صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے اور گھر کا سامان بندھا پڑا تھا۔ گھر کے صحن میں ایک بیل گاڑی انتظار کر رہی تھی۔ دس بجے کے قریب راہب نمودار ہوا اور اُس کے ہمراہ اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو اُس کے راہبانہ سکول میں پڑھتا تھا۔ جونہی وہ قریب آیا اُسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ ایک مرتبہ پھر یہ مجھ سے راہبانہ زندگی ترک کر دینے کے لیے کہیں گے۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تو اُس نے بیل گاڑی دیکھی۔ وُہ گھر میں داخل ہوا تو سامان بندھا ہوا دیکھا۔ وہ اُس چٹائی پر بیٹھ گیا جو اُس کی خالہ نے احتراماً بچھائی ہوئی تھی۔ پھر ماپا کو تلاش کرنے لگا۔

خاصی دیر کے بعد ماپا کھانے کی ٹرے ہاتھ میں لیے نمودار ہوئی۔ اُس نے بڑی اداس آنکھوں سے اور دُکھ بھری چال سے کھانا اُسے پیش کیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بہت بنی ٹھنی ہوئی ہے۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر نگاہ کی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وُہ ایسا کیوں کر رہی ہے لیکن وہ یہی سوچتا رہا کہ جب اُس سے راہبانہ زندگی کو چھوڑنے کے لیے کہا جائے گا، اور ماپا ضرور کہے گی، تو وُہ کس طرح انکار کرے گا۔ کھانے کے بعد ماپا نے ٹرے اُٹھالی اور اُس سے کچھ فاصلے پر بے حد مؤدبانہ انداز میں عقیدت سے لبریز ہو کر بیٹھ گئی۔ جونہی راہب نے وعظ دینے کے لیے منہ کھولا ماپا نے اپنی خالہ سے کہا: ''خالہ کیا گاڑی بان ابھی تک نہیں آیا؟''

راہب، جو ابھی وعظ شروع نہیں کر پایا تھا، بیل گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ماپا، یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اُس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''میں اِس مجرد شخص کو سب کچھ بتا دوں گی۔'' ماپا نے سر اُٹھائے بغیر راہب سے کہا۔

''خالہ اپنے گاؤں واپس جانا چاہتی ہے۔ وہ چلی گئی تو میرے لیے دکانداری کرنا اور بچوں کو بھی سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے میں مجرد شخص سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ مجھے اور بچوں کو خالہ کے گاؤں چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمائے۔ سب سے بڑا بچہ مجرد شخص کے پاس ہی رہے گا۔''

اُس نے بڑے بیٹے کی جانب جھک کر کہا: ''بیٹے تم مجرد شخص کے پاس رہو۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے رخسار پر بہتا ہوا ایک آنسو پونچھا۔

راہب ایک گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

''مجرد شخص اگر چاہتا ہے تو بے شک ساری زندگی راہب کے لبادے میں گزار دے۔ اُس کی صابر عورت کسی نہ کسی طرح زندگی گزار لے گی۔ اُس کی اور مجرد شخص کی دنیا ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک طویل فاصلہ ہے چنانچہ آج کے بعد اِن دونوں کے درمیان صرف ایک راہب اور ایک عقیدت مند کا رشتہ ہوگا۔ چونکہ اُس کے دو بچے بھی ہیں اس لیے اگر کبھی اُسے کوئی ایسا شخص ملا جو قابلِ اعتبار ہوا تو وہ شاید اُسے قبول کر لے۔ اسی لیے وہ یہ ساری چیزیں کھل کر بیان کر رہی ہے تا کہ بعد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔''

راہب نے حیرت سے ایک ہلکی سی آہ بھری۔ ماپا نے اپنی آنکھوں کو تھوڑا سا اُوپر اُٹھایا۔ راہب کے ہاتھ اُس کے لبادے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ وہ ماپا کو دیکھتا رہا۔

ماپا نے اپنا بیان جاری رکھا: ''یہ ہم دونوں کی بہتری کے لیے کیا جا رہا ہے مجرد شخص پوری آزادی کے ساتھ مذہبی قانون پر عمل کرے گا اور اُس کی بے چاری عقیدت مند، اگر اُسے کوئی مرد مل گیا تو، بے چاری۔۔۔۔۔''

''تمھاری خالہ کے گاؤں میں تو ہر طرف شرابی ہی شرابی ہیں۔'' راہب کہنے لگا۔

''میں اپنی عام زندگی کی طرف لوٹ آؤں گا۔''

ماپا________ ایک مرتبہ پھر________ کوہسن کی بیوی بن گئی۔

شائن احمد
(ملائشیا)

عورت

سیتی فرش پر بیٹھی تھی، ٹانگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سختی سے بھینچے ہوئے جیسے پیچدار پتوں کی چٹائی بُنی ہوتی ہے۔ اُس نے اُداسی سے اپنا سر جھکا دیا۔ وقتاً فوقتاً اُس کی روشن آنکھیں چمکتی تھیں اور کبھی کبھار وہ بڑی مشکل سے تھوک نگلتی۔ باہر ریتیلے صحن میں ہینڈسم نے اپنا سر اُٹھایا اور بانگ دینے لگا۔ اُس کی کلغی تیزی سے ہلی۔ اُس کا باپ گھر کے مرکزی ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا، بائیں پاؤں کو اپنے آگے رکھے اور دائیں ٹانگ کو ایک خاص زاویے پر جھکائے ہوئے۔ پان چباتے ہوئے اُس نے صحن میں نگاہ دوڑائی اور پرانے، گھنے اور سیاہی مائل سبز کیدانگسا لیموں کے درخت کو پیار سے دیکھا۔ جو اُس کے پہلو میں تھی، نیند سے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ خُرخُر کرنے لگی۔

اُس کی ماں باورچی خانے میں تھی اور وہ کچھ کاٹ رہی تھی جو آگ جلانے والی لکڑی یا ناریل بھی ہوسکتا تھا۔ تب سیتی نے اُسے کھردرے فرش پر چلتے ہوئے سُنا وہ کمرے کے درمیان تک جارہی تھی۔ گھٹنوں کے بل جُھکنے کے بعد ماں نے بے حد کڑواہٹ سے براہ راست اپنے دل کی بات کہہ دی: ''گزشتہ رات چھوٹی خالہ اور خالو حاجی رحمت کی جانب سے نیک خواہشات کا اظہار کرنے آئے تھے۔ وہ مقدس شخص تمھارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔'' کیوئی رینگتی ہوئی

سیتی کے پاس چلی گئی اور پھر آرام سے اُس کی گود میں بیٹھ گئی۔ بلی کے بچے کا بدن ایک کمان کی طرح اوپر ہوا، جیسے ایک رس بھرا دُریان پھل ہوتا ہے، پھر وہ خُرخُر کرنے لگی جیسے وہ چاہتی ہو کہ اُسے پیار سے تھپکا جائے۔ بد بخت بلی۔سیتی نے بلی کے نرم پیٹ پر ایک زور کی چٹکی لی۔وُہ بہت غصے میں تھی۔ کیوٹی ہڑ بڑا کر اٹھی، میاؤں میاؤں کرتی بھاگی، اپنا رخ بدلا اور پھر گھر کی سیڑھیاں اُتر گئی۔سیتی نے انگلیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑا اور دانت کچکچائے۔

ہینڈسم نے ایک مرتبہ پھر بانگ دی اور اپنی کلغی زور سے ہلائی اُس کی آواز پہلے سے بلند تھی ''یہ بھی بد بخت ہے۔'' سیتی نے غصے سے اپنی بائیں انگلی چٹائی میں گھسیڑ دی۔سب بد بخت ہیں، سب کے سب۔

مڑتے ہوئے اُس کے باپ نے اپنی ٹانگ سیدھی کی اور پھر پان کاوُہ حصہ چبانے لگا جس پر چونا لگا ہوا تھا۔ پھر اُس نے اپنی ٹانگ دوبارہ جھکائی اور پان کا بقیہ حصہ چبانے لگا۔اُس نے اپنی زبان کو گال کے ساتھ پھیرا تاکہ سارے کا سارا پان گھل جائے۔اُس کی نگاہیں پھلوں سے لدے ہوئے گیدانگسا کی جانب لوٹیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ اس مرتبہ بہت اچھا جا رہا ہے۔

''ہم چھوٹی عید پر تمھاری منگنی کر دیں گے اور بڑی عید پر تمھاری شادی ہو سکتی ہے۔''

ہینڈسم سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور بہت اونچی آواز میں بانگ دینے لگا۔اُس نے اپنا سر ہلایا تو اُس کی کلغی بھی ہلی۔

''شو۔۔۔۔۔شودو۔''

مُرغ نے ہڑ بڑا کر اوپر دیکھا اور پھر سر ٹیڑھا کر کے دیکھنے لگا۔اُس کی کلغی ہوا میں لہرائی۔

''شو۔۔۔۔۔شودو۔''

ہینڈسم نے پھر بانگ دی جیسے مُرغیوں میں سے کسی ایک کو چیلنج کر رہا ہو۔

اُس نے زمین پر چھلانگ لگائی اور بھاگنے لگا۔

سیتی نے اپنا سر جھکا دیا۔ بہت نفاست سے بُنی ہوئی چٹائی پر چار خانے بنے ہوئے تھے۔ چٹائی کے کونے مُڑتے جا رہے تھے۔وہ چھوٹا سا سوراخ، جو چار خانوں کو جُدا کرتا تھا، بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ چٹائی مُڑی تڑی ہوئی تھی اُس کے کنارے ادھر اُدھر سے ٹوٹ رہے تھے۔اُسے یوں لگا جیسے پوری چٹائی اُس کی نظروں کے سامنے یک دم گھومنے لگی ہو۔سیتی کا سر چکرانے لگا۔

اُس کا دل بُری طرح دھڑ کنے لگا ۔ یک دم وُہ پسینے میں بھیگ گئی اور اُس کی رگیں پھڑ کنے لگیں

''شودو۔'' اُس کی ماں چیخی اور اُس نے اس طرح تالی بجائی جیسے کوئی ''سِلا ت''
لڑنے والا ایک مخصوص پوزیشن لیتا ہے ۔

سیتی یک دم کھڑی ہوگئی ۔ اُس کی نبض تیز ہورہی تھی ۔ وُہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور کھڑکی بند کرنے کے بعد بیٹھ گئی ۔ پھر اُٹھی اور پھر بیٹھ گئی اور پھر یک دم کھڑی ہوئی اور کھڑکی کھول دی ۔ دھان کے بیتنچے ہوئے کھیت دُور تک دکھائی دے رہے تھے ۔ سیتی اپنی ٹھوڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کو بیٹھ گئی ۔ کیوٹی کمرے میں آئی اور اُس نے اپنی دُم اُس کے ٹخنے کے ساتھ رگڑی ۔ سیتی نے جھک کر اس بد بخت بلی کو اُٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا ، چیکو کے درخت کی جانب ۔ کیوٹی دوہری ہوگئی ، ہوا میں اُچھلی اور بھاگتی ہوئی چاول کوٹنے والے پر چڑھ گئی اور وہاں وُہ ایک مرتبہ پھر پیچھے مُڑی ۔

''بد بخت ۔''

''سؤر ۔''

اُس نے کھڑکی کے پَٹ تڑاخ سے بند کر دیے ۔

سیتی کمرے کے کونے میں اپنے گھٹنوں کے گرد بازو کسے زار زار روئے جارہی تھی ۔ اُس نے اپنے گھٹنوں میں اپنا سر لٹکا لیا اور اپنی ایڑیوں کو ساتھ ملا لیا تاکہ وُہ بہت چھوٹی اور حقیر لگے ۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں ۔ اُسے ایسا لگا جیسے وُہ ایک اتھاہ تاریکی میں کھوگئی ہے ۔ اُس نے سوچا کہ اگر وقت آنے پر وُہ بہت ہی چھوٹی ہو جائے تو وہ کیا کرے گی ۔ وہ فرش کے پھٹوں کے درمیان ایک چھلے ہوئے لال بیگ کی طرح رینگ سکتی تھی اور ستون کے راستے زمین پر جاسکتی تھی ۔ وہاں کیوٹی اور ہینڈسم بھی نہ ہوں گے جو اپنی خوفناک آوازوں سے اُسے تنگ کرتے تھے ۔ اگر اُس کے پَر ہوتے تو وُہ ناریل کے درخت کی چوٹی پر جا بیٹھتی اور ہوا کے سامنے دوہری ہو جاتی ۔ یا پھر سیدھی آسمانوں میں پرواز کر جاتی اور سفید نرم بادلوں کا تعاقب کرتی ۔

اُس کے بال اُس کی کمر پر لہروں کی طرح بل کھا رہے تھے ۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں ۔ چھت میں ایک کالے مکڑے نے جالا بُن رکھا تھا ۔ سُورج کی شعاعیں اس جالے پر پڑتیں تو ہزاروں سمتوں میں بکھر جاتیں سیتی کھڑی ہوئی اور بے دھڑک الگنی کی جانب چلنے لگی ۔ اُس نے ایک سارونگ اتار کر اُس کے آخر میں ایک سیب جتنی بڑی گانٹھ دی اور پھر اُسے ہوا میں

اُچھال دیا۔ یہ سیب چھت کو جا کر لگا اور جالے کو توڑتے ہوئے سُستی سے فرش پر آ گرا۔ سیٹی نے اُسے اپنی دائیں ایڑی سے کُچل دیا۔

''لعنت ہو ہر اُس شخص پر جو زندہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر شے پر لعنت ہو۔''

اُس نے پُر جوش انداز میں اپنے آس پاس کے کسی نئے شکار کو تلاش کیا ایک چھپکلی کو جونہی معلوم ہوا کہ کیا ہونے والا ہے وُہ تیزی سے ستون کے اوپر چڑھ گئی۔ سیٹی نے چھپکلی کو گانٹھ والے سارونگ سے مارنے کی کوشش کی۔ چھپکلی چھپتی چھپاتی وہاں سے بھاگ گئی۔ ''اگر میں نے تمھیں پکڑ لیا''، اُس نے سوچا ''تو میں تمھارا سر اور پیٹ کُچل دوں گی۔ میں اپنی ایڑی سے تمھاری کمر توڑ دوں گی اور پھر دُم کو اس طرح ناچتے ہوئے دیکھوں گی جیسے گرم توے پر ایک سُنڈی پھڑکتی ہے۔ سیٹی اپنی بائیں جانب مڑی۔ دیوار کے کھردرے تختے اُسے غصہ دلاتے تھے۔ اُس نے اُنھیں زور سے پیٹا۔ وُہ دائیں طرف ہوئی۔ چیونٹیوں کی ایک قطار ستون کے اُوپر چڑھ رہی تھی۔ اُس نے اُنھیں ہتھیلی میں جمع کیا اور پھر اتنا رگڑا کہ وُہ گودے میں بدل گئیں۔

''لعنت!''

''سؤر!''

سیٹی نے اپنے آپ کو آئینے میں گھورتے ہوئے دیکھا۔

اُس نے اپنے چہرے پر سلوٹیں ڈال کر مزاحیہ تاثر دینے کی کوشش کی۔ ایک طویل عرصے تک وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی سیاہ آنکھوں کو گھورتی رہی۔ اُس نے اپنی ٹانگ مروڑی۔ گال پُھلائے اور منہ بگاڑا۔

''میں نہیں چاہتی، میں نہیں چاہتی، میں نہیں چاہتی!''

''بہت غصے میں تھی۔ اُس کا غصہ اُس کی رگوں میں راہ پا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آئینے سے دوچار ہوئیں۔

''سیٹی''

''ہاں، ماں۔''

اس نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ دروازہ کھولنے پر آمادہ کیا۔ بڑی احتیاط سے وُہ کمرے میں چلتی ہوئی باورچی خانے کی طرف گئی تاکہ اُس کا باپ اُسے نہ دیکھ پائے اور وُہ ابھی تک مرکزی ستون سے ٹیک لگائے ریتیلے صحن کو دیکھ رہا تھا ہینڈسم نے زور سے ایک ککڑوں کُوں کی

اور اپنے پَر پھڑ پھڑائے''لعنت۔'' سیٹی نے چاقو سے ایک پیاز کو کاٹ کر رکھ دیا اور پھر اُس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے۔

''لعنت۔''

''سیٹی۔'' اُس کی ماں نے اُسے پھر خبردار کیا۔

اُس نے اپنے اُس غصے پر قابو پانے کی کوشش کی جو اُس کے بدن میں اُبل رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وُہ پیاز کو آہستہ آہستہ کاٹتی رہی لیکن پھر وہ تیز ہو گئی۔۔۔۔۔۔ تیز سے تیز تر ۔۔۔۔۔اُس نے کاٹنے والے چاقو کو زور سے دبایا۔

''سیٹی۔''

ہانڈی چولہے پر دھری تھی اور اُبل رہی تھی اور اُس کا ڈھکنا ہل رہا تھا۔ سیٹی کھڑی ہو گئی اُس نے شیلف پر سنتوک کی ڈوئی اٹھا کر ڈھکن کو دھکیلا تا کہ وُہ ایک طرف ہو جائے۔ اُس نے ڈوئی کو ہانڈی کے اندر تک ڈال کر خوب ہلایا اور اتنا ہلایا کہ ہانڈی اپنی جگہ سے ہل گئی اور اُبلتا ہوا پانی آگ پر گر گیا۔

''سیٹی۔''

وہ اب بھی کسی چیز پر حملہ آور ہونے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اُس نے پھر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ کوئی بھی زندہ شے۔ لیکن ہر شے مُردہ تھی۔ دھات کے چمچے، ڈوئیاں، چینی کے چمچ، کچی مٹی کے برتن اور اُن کے ڈھکن۔ اتنے ہی مُردہ اور ہتھیار ڈال دینے والے جتنی کہ وُہ خود۔۔۔۔ایک عورت۔۔۔۔ان کے علاوہ واحد زندہ شے اُس کی ماں تھی جو چوکھٹ میں بیٹھی چٹنی کوٹ رہی تھی۔ ماں کا بدن اس طرح ہل رہا تھا جیسے کسی تیز رو دریا میں اُگا ہوا کوئی تنا ہلتا ہے۔

''میں نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی۔''

آواز اُس کے اندر گونجنے لگی۔ اُس کے شدید غصے اور بوریت کے ساتھ شدید ہوتی ہوئی آواز! اُس کے ذہن میں جو طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے لکڑی کی جالی کی طرح آپس میں جُڑے ہوئے تھے اور پھر وُہ سارے بکھر گئے۔ اُس کی کڑکتی ہوئی آواز اُس کے اندر بند تھی اور اُس کے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کوئی طریقہ نہ تھا کہ وُہ یہ بات کر سکے۔

وہاں کچھ بھی نہ تھا۔۔۔۔۔۔ بالکل کچھ نہ تھا۔۔۔۔وُہ ایک عورت تھی۔۔۔۔۔

ایک ہتھیار ڈال دینے والی مُردہ شے۔ وُہ صرف ایک چمچہ تھی، ڈوئی تھی۔۔۔۔۔۔ مُردہ اور بے حس وحرکت۔ وُہ ایک مرتبہ پھر کناروں تک اُبلتی ہوئی ہانڈی کی طرف مُڑی۔ ڈھکن اوپر نیچے اُچھل رہا تھا اور اُس پر وُہی جھاگ لگی ہوئی تھی جو ہانڈی کے کناروں سے نکل کر بہہ رہی تھی جیسے کسی بوڑھے آدمی کی تھوک ہو۔ سیٹی نے ہانڈی کے سیاہ اور تاریک نچلے حصے کو دیکھا جسے شُعلوں کی زبانیں چاٹ رہی تھیں اور وہ ہر جانب لہراتی ہوئی بل کھا رہی تھیں۔ اُس نے مصالحہ کُوٹنے والا ایک ڈنڈا اُٹھایا اور اُسے آگ میں دھکیل دیا۔ اُسے جلد ہی آگ نے اپنی لپیٹ میں لیا۔ سیٹی نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دانت بھینچے اور اپنی سانس کو زیادہ سے زیادہ دیر تک روکے رکھنے کی کوشش کی۔ اُس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا اور اُس کی ساری کوشش کے باوجود، کہ وہ یوں نہ دھڑکے، وہ دھڑک رہا تھا۔ یہ سب کچھ فضول تھا : چمچے اور ڈوئیاں! اگر ضرورت ہے تو بے شک ایک لے لیجیے۔ میں ایک چمچہ ہوں، ڈوئی ہوں، مُردہ اور بے حس و حرکت!

''سیٹی!''

اسے کی ماں نے جلدی سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پرے کیا اور اُس پر تُھوکا اور ساتھ ہی وُہ کوئی دُعا وغیرہ پڑھنے لگی۔ وُہ اُسے گھسیٹتی ہوئی درمیان والے کمرے میں لے گئی جہاں اُس کا باپ کسی دلدلی کچھوے کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ وُہ یک دم اُٹھ بیٹھا اور کسی دوائی کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگنے لگا اُسے صرف ایک مرہم ملی جو ایک بھوری اور گندی بوتل میں تھی اور اُس پر ایک اونٹ کی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ اُسنے سیٹی کی انگلی پر تھوڑی سے مرہم لگائی۔

''اب اِس پر پٹی باندھ دو۔''

ماں نے بیٹی کی انگلی پر پٹی باندھ دی۔

سیٹی اپنا ہاتھ آگے کیے ماں باپ کو اس کی دیکھ بھال کرنے دیتی رہی تاکہ وُہ جو جی چاہے کرتے رہیں۔ میں کل اُس کی انگلی کو اُبلتے پانی میں ڈال دوں گی جس پر شادی کی انگوٹھی پہنی جاتی ہے اور اُس نے اگلے روز میں اپنی چھوٹی انگلی کے ساتھ یہی کچھ کروں گی۔ وُہ جو جی میں آئے کرتے رہیں۔ ایک ایسا دن بھی آئے گا جب اُس میں اتنی ہمت ہو گی وُہ اُن کے مُنہ پر حاجی رحمت کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دے گی۔ اُسے صرف ہمت درکار تھی۔ طاقت اور بے خوفی۔

''میں نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی۔''

یہ آواز جیسے اُن زنجیروں سے ٹکراتی رہی جنھوں نے اُسے قید کر رکھا تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کرتا تاکہ وُہ اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکے_____ ایک عورت کی حیثیت سے اور ایک انسان کی حیثیت سے۔ یہ آواز اُس کے پیٹ میں اور دل میں زنجیروں سے بندھی ہوئی قید تھی۔ وُہ کچھ کہنا چاہتی لیکن ہر بار اس کی آواز دم توڑ دیتی کیوں کہ وُہ ایک نرم اور کمزور جسم میں قید تھی۔ ''میں نہیں چاہتی، میں نہیں چاہتی'' وُہ جتنے زور سے چیخ سکتی تھی چیخی۔ اُس کی آواز قید میں تھی تو بہادر اور نڈر تھی لیکن جونہی باہر آئی وہ گونگی اور مُردہ تھی وُہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی یہ جانتے ہوئے کہ اُس کی ماں بڑے پیار سے اُس کے پیچھے پیچھے آجائے گی یا اُسے باورچی خانے میں واپس بلالے گی۔ اُس کے کمرے اور باورچی خانے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ وُہ درمیان والے کمرے میں بہت کم جاتی جہاں اُس کا باپ مہمانوں کو بٹھاتا اور دوپہر کے وقت سویا رہتا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی کھولتے ہوئے اُس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ تاحدِ نظر دھان کے کھیت ایک ایسے جنگل کی مانند تھے جو اُس کی زنانہ دنیا کو گھیرے ہوئے تھے۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا جو اُس کے اُوپر مچھلی پکڑنے والے ایک کانٹے کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ بادل گہرے سیاہ اور برسنے والے ہوگئے۔ وہ جنوں اور دیووں کی تاریک دنیا کی طرح سیاہ تھے اور یہی جن اُسے آسمان پر پرواز کر جانے سے روکتے تھے جیسا کہ وہ کرنا چاہتی تھی۔ اگر اُس کے پَر ہوتے تو وُہ کسی طائر کی طرح اُڑتی۔ ہر روز اسے اُس کا کمرہ پہلے سے بڑھ کر جہنمی دکھائی دیتا۔ وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتی تھی اور اپنے ماں باپ کو بھی جو اُسے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اُس نے بادلوں کی طرف دیکھا کہ شاید وہاں کوئی پرندہ ہو۔ بارش سے بھرے ہوئے بادل نزدیک آرہے تھے۔ وہ جلد ہی زمین کے ساتھ لگنے والے تھے۔ سیٹی اپنی ماں کے ساتھ صرف ساحل تک جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ اُس نے نیچے دیکھا کہ شاید وہاں آزادی ہو۔ زمین ایک سنگلاخ چٹان کی طرح تھی اور اُس میں کہیں اتنی جگہ نہ تھی کہ وہ رینگتی ہوئی اُس میں گھس جائے، سوائے قبر کے۔ صرف وہاں ہمیشہ کے لیے آزادی مل سکتی تھی ---------

قبر میں --------- قبر میں!

وُہ لرز گئی کہ یہ میرے خیالات اتنے خوفناک کیوں ہو رہے ہیں؟ وُہ یک دم خوفزدہ

ہو گئی۔ وہ یہ تو نہیں چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔موت آزادی تھی۔۔۔۔۔۔لیکن وُہ آزادی نہیں جس کی اُسے خواہش تھی۔ سیٹی کو ہمیشہ سے اپنے کنوارپن کا احساس تھا۔ ایک کنواری زمین کے ایک ایسے زرخیز ٹکڑے کی مانند ہے جو تسلط کا انتظار کرتا ہے۔۔۔۔۔۔تسلط دراصل آزادی ہے لیکن یہ نہیں کہ فاتح حاجی رحمت ہو۔ کوئی اور ہونا چاہیے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ کون لیکن اُسے اُمید تھی اور یقین تھا کہ وُہ کہیں تھا ضرور۔ ہر کہانی کا ایک ہیرو ہوتا ہے، ہر بچے کا ایک باپ ہوتا ہے، ہر زمین کے ٹکڑے کا ایک قانونی مالک ہوتا ہے۔ ایک روز قانونی مالک ضرور آئے گا۔ وُہ اُس مقدس دن کا انتظار کرے گی۔

کھڑکی بند کرنے سے وہ دوپہر کی نیم تاریکی میں چلی گئی۔ بادلوں کی سیاہی اس تاریکی کو اور بھی گہرا کر رہی تھی۔ سیٹی کمرے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور اُس کی زخمی اُنگلی گھٹنوں پر رکھی تھی۔ اُس کی اُمیدیں اتنی ہی تاریک تھیں جتنے کہ سیاہ بادل جو آسمان پر تیرتے تھے۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا، اُسے پورا یقین تھا۔ تب وہ ایک عورت ہوگی اور وہ اُسے اپنا بنا لے گا، اپنے پیار کے زور سے۔ لیکن اس کے والدین نے ایک اور مالک تلاش کر لیا تھا اور وُہ ایک ظالم شخص تھا۔ سیٹی اُس کے بدن کے بارے میں سوچتی تو خوفزدہ ہو جاتی۔

''سیٹی۔''

وُہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''سیٹی''

اُس نے کھڑکی کھول دی۔

''ہاں، ماں۔''

اس کی زخمی اُنگلی میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اُس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے بال سنوارے اور دروازے کو آہستہ سے کھولا۔ آسمان شفق رنگ تھا۔ بارش آنے کو تھی۔ وہ جلدی سے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

''سیٹی۔''

''ہاں، ماں۔''

وُہ بائیں مُڑی اور اُس نے دیکھا کہ درمیان والے کمرے میں اس کی ماں اُس کے باپ کے ساتھ بیٹھی ہے۔ باپ ایک پھندے کو بل دے رہا تھا۔ سیٹی گھٹنوں کے بل ماں کے قریب

بیٹھ گئی ۔ شفق نے ہر شے کو اپنی خوبصورتی سے جکڑ رکھا تھا ۔ ہینڈسم اپنے پنجرے میں میں جا چکا تھا ۔ کیوٹی گرنے کے بعد کہیں بھی دیکھی نہیں گئی تھی ۔ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی ۔

سیٹی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے اس کی ماں نے پکڑ لیا اور سر ہلا کر اپنی بیٹی کے چہرے کو گھورنے لگی ۔ اُس کا باپ مُڑا اور ایک جمائی لے کر جال کو ایک طرف رکھ دیا ۔

اُس نے سر جھکا لیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے چٹائی کو کُھرچنے لگی ۔ اُس نے اپنی زبان ہونٹوں تلے دبا رکھی تھی ۔ سیٹی کے لیے ایک روشن مستقبل کا کوئی امکان نہ تھا ۔ ہر شے مکمل طور پر سیاہ تھی ۔ جہاں تک اُس کے والدین کا تعلق تھا حاجی رحمت کی پیشکش مقدس تھی ۔ اور اس قسم کی خوش قسمتی کسی کو کم ہی نصیب ہوتی تھی ۔ یہ ایک معجزہ تھا ۔ دس برس پیشتر جو بیج خانہ کعبہ میں بوئے گئے تھے وہ سُنا ہے کہ یک دم پُھولنے اور پھلنے لگے تھے ۔ اگر یہ بیج کسی زرخیز زمین میں بوئے جائیں ، جو بالکل کنواری ہو ، تو پھل بے شمار ہو گا : اس دنیا میں بھی اور اگلی دنیا میں بھی ۔

''تمھیں ابھی سے یہ سوچنا چاہیے کہ تمھیں کس کس چیز کی ضرورت ہو گی ۔ '' چادریں ، پردے ، تکیے ، ایک مچھر دانی ۔ رمضان شریف گزرنے کا انتظار مت کرو ، عید آئی کہ آئی ۔ ہمیں نیاز چڑھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے ۔ کچھ تو تیاری کرو ۔ ''

ماں جہاں تھی وہاں سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی ۔ باپ نے اپنا جال اُٹھایا اور انگلیوں سے اُسے جانچنے لگا ۔ سیٹی بے حد فرمانبرداری سے سر جھکائے چٹائی کو کھینچتی رہی ۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ پٹی اُتار دی اور اپنی انگلی کو بائیں مُٹھی میں دبا دیا ۔ اُس نے انگلی کو اپنی پوری قوت سے رگڑا ۔ وہ بار بار ایسا کرتی رہی ۔ اس دوران وُہ آرام سے اپنے والدین کے پاس بیٹھی رہی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو ۔ خون اور پیپ کا ایک فوارہ چھوٹا ۔ اُس نے انگلی کو پھر رگڑا ۔ خون اور پیپ بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں سے نکل کر اُس کی مُٹھی پر پھیل گئی ۔ اُس نے آرام سے پہلو بدلا اور بڑے خوبصورت طریقے سے اپنے بلاؤز کا کنارا اپنی گود میں گرا دیا ۔ اُس نے اپنی خون آلود مٹھی کو کپڑے میں لپیٹ دیا ۔ پھر اُس نے سر جھکا دیا ۔ پُوری دنیا سُن ہو کر رہ گئی تھی ۔

''لالٹینوں کو صاف کرو ۔ ''

سیٹی نے اپنے ہاتھ کو بڑی احتیاط سے چھپاتی ہوئی اٹھی ۔ وُہ باورچی خانے کی طرف چل دی ۔ اسے اس حقیقت کا احساس تھا کہ وُہ ایک چمچے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ، ۔ ایک ڈوئی یا چینی کا چمچ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مُردہ اور بے حس و حرکت شے !

جولیس فلورس (علی بیدانو)
(فلپائن)

عورت

اگنس نے اپنی چھاتی سے بچے کا منہ علیحدہ کیا۔ بچہ اب سو رہا ہے۔ وہ آرام سے سانس لے رہا ہے اور اُس کا سینہ ہولے ہولے اُوپر نیچے ہو رہا ہے۔ اگنس نے ایک لمحے کے لیے بچے کے ناک نقشے کی طرف دیکھا اور پھر چٹائی پر لٹا دیا۔ اُس کا دُھوپ کھایا چہرہ خوش شکل ہے۔ ہونٹ پتلے، ناک اونچی اور بال گھنے۔ صاف ظاہر تھا کہ وُہ کریانتو پر گیا ہے۔

ایک روز، اگنس نے یاد کیا، وہ اور کریانتو قصبے کی منڈی میں ملے تھے۔ اُس زمانے میں وُہ سبزیاں فروخت کیا کرتی تھی۔ آلو، پیاز، مولیاں، گوبھی، ٹماٹر۔ وہ بکثرت نہیں آتی تھی اور اس نے جان لیا تھا کہ کریانتو کو بھی اس ملاقات کی توقع نہیں تھی۔ وہ دوسری جانب جانے ہی والا تھا کہ اس نے اُسے بلا لیا۔ وُہ دانت لگچا تا ہوا اُس کی جانب آیا۔ مونچھیل، خوش رو جوان۔ وہ سیاہ اور سفید دھاریوں والی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ سوچے بنا بولنے لگی۔ اس ملاقات سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ سننے کے لیے اردگرد جمع ہو جانے والے کانوں، متجسس آنکھوں اور لبوں کی حقارت آمیز مسکراہٹ سے بے نیاز بولے چلی گئی۔

''تم لڑکے سے ملنے کے لیے بھی نہیں آئے۔''

''یہ لڑکا کون ہے؟'' کریانتو نے غصے میں پوچھا۔

''ہمارا بچہ اور کون؟ مجھ سے تمھارا بیٹا۔''

کریبانتو شرما گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا پھر اس پر زردی چھا گئی۔ غصے میں آ کر اُس نے اُن لوگوں کی طرف دیکھا جو تماشا دیکھنے کے لیے کھڑے تھے۔ کریبانتو قصبے کا سپاہی ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے پانچ بچے ہیں، تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔

''یہ عورت پاگل ہے۔'' کریبانتو بڑبڑایا اور جانے کے لیے مُڑا۔

''لڑکا بیمار ہے۔'' اُس نے پھر کہا، ''اُس کو بخار آ رہا ہے۔''

کریبانتو خریداری کے لیے آئے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔ چہرہ چھپانے کے لیے اُس نے اپنی نظریں اُن چیزوں پر جھکا لیں جنھیں وُہ فروخت کر رہی تھی۔ بانس کے چھابے میں گوبھی، آلو، ٹماٹر، مولیاں پڑی تھیں اور پیاز کا ایک ڈھیر اس اخبار پر دھرا تھا جو اُس نے بجری کے گندے فرش پر بچھا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اُس کے رخسار گندے تھے اور آنکھوں میں اداسی تھی۔ اس کے بال جڑے ہوئے تھے اور ہوا میں اُڑ تے تھے۔ اُس نے سامنے بیٹھی عورت کی طرف دیکھا جو اسی کی طرح سبزیاں بیچتی تھی اور اُسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری عورت نے شرمندہ ہو کر نظریں پھیر لیں۔

اس نے نظریں چرا کر دیکھا باقی لوگ بھی اُس کی جانب دیکھ رہے تھے لیکن اُس نے اُنھیں نظر انداز کر دیا۔ وہ خریداروں کو بلانے کے لیے آواز لگاتی رہی۔ اس کے زندہ رہنے کے لیے یہ چھوٹا سا کاروبار بہت اہم تھا۔ وُہ گھر چلی گئی۔ اُس نے دیکھا اُس کی چھ سالہ بڑی بچی سالی کی گود میں بچہ روئے چلا جا رہا تھا۔

پچھلے برس جشن کے دوران اُس کی کریبانتو سے ملاقات ہوئی تھی۔ وُہ چوک کے قریب باسکٹ بال کورٹ کے قریب کھڑی تھی جسے رقص گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا اور وہ رقص کرتے ہوئے جوڑوں کو دیکھ رہی تھی کہ اُس نے کریبانتو کو اپنی جانب کچھ عجیب نظروں سے تکتے ہوئے دیکھا۔ جب اُس نے کریبانتو کی طرف اوپر دیکھا تو اُس کی ٹھوڑی اُس کے بالوں کو چھو رہی تھی۔

رقص بہت پُر لطف تھا۔ اگنس بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کا قہقہہ بلند تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ سپاہی آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا ہے یہاں تک کہ اُس کا پیٹ اُس کی کمر کو چھونے لگا۔ اُس نے کریبانتو کے سینے کی گرمی کو اپنی رگوں میں رینگتے ہوئے محسوس کیا اور اُس کے سانس اس کے بالوں پر تھے۔ ایک عجیب سی گرمی اُس کے جسم اور قلب میں سرسرائی۔ وہ رقاصوں کو

دیکھتی اور ہنا رُ کے قہقے لگاتی رہی پھر بھی اس کا سانس بتدریج بھاری اور مشکل ہونے لگا اور پھر جیسے کوئی بگولہ اُسے اُٹھا کر لے گیا ہو۔

وہ آدمی اُس کے دونوں کندھوں کو تھامے ہوئے تھا۔ وہ اب باسکٹ بال کورٹ میں نہیں بلکہ پرائمری سکول کے پاس تھے۔ آسمان ستاروں سے دمکتا تھا۔ اگرچہ ہوا خنک تھی لیکن وہ گرمی محسوس کر رہی تھی۔ کریسانتو کی ہتھیلیاں اس کے کندھوں پر گرم ہو رہی تھیں۔ وُہ آدمی اُس کی گردن پر بوسے ثبت کر رہا تھا اور اُس کی انگلیاں اُس کی پشت پر چل رہی تھیں۔ پہلے تو آرام سے لیکن پھر کھینچتے بچھاڑتے اور بے قابو ہوتے ہوئے۔ ''اگنس۔'' بالآخر اُس نے کریسانتو کے پوچھنے پر اپنا نام بتایا۔

''اگنس'' کریسانتو نے دہرایا۔ اُس کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ اُس کی گردن سے ہٹا لیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ نیم تاریکی میں وہ بھی ہوش میں آئی اور اُس نے کریسانتو کے تنومند اور بڑے جسم کو اپنے سامنے دیکھا جو اس پر جھکا ہوا تھا۔

''اب کھڑی ہو جاؤ۔''

وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے سگرٹ کے ساتھ چمٹے ہوئے پتے اور کانٹے الگ کیے۔ کریسانتو جا رہا تھا۔ وُہ اُس کے پیچھے گئی۔

''تم کہاں رہتی ہو؟'' کریسانتو نے پُوچھا۔

''مگڈ الینا میں۔''

''چوک میں ۔۔۔۔۔۔''

''ہاں''

''کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمھارے پاس آیا کروں؟''

اُس نے کریسانتو کے ہاتھ کو دبا لیا۔ وُہ اس کے قریب ہو گئی۔ وہ اب اُس جگہ پہنچ رہے تھے جو بجلی کے کھمبے کے بلب سے روشن ہو رہی تھی۔ سکول کی عمارت کے بعد کریسانتو رُک گیا۔ ''تم جاؤ۔'' وُہ ہچکچائی۔ سپاہی نے بڑے آرام سے دھکیلا۔ ''میں نے کہا نا تم جاؤ۔ مجھے یہاں ابھی کچھ کام ہے۔''

اُس نے ایسا ہی کیا۔ کریسانتو کی آواز سخت نہیں تھی لیکن اُس میں ایک قوت تھی جو اُس کی پُوری مردانگی کی مظہر تھی۔ جب وہ روشن حصے کے قریب آئی تو اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ کریسانتو

جا چکا تھا۔

اپنے وعدے کے مطابق کریانتو اُس کے ہاں آیا۔ وہاں سالی کے علاوہ کوئی نہ تھا اور وُہ ابھی بہت چھوٹی معصوم تھی۔ سالی کا باپ ایک مچھیرا تھا۔ وُہ پالاوان میں مچھلیاں پکڑنے گیا اور تین برس سے نہ وہ خود آیا تھا اور نہ ہی اُس کا کوئی خط۔

اُس کا جھونپڑا کیلے کے ایک گھنے جُھنڈ میں پوشیدہ تھا۔ اُس کے جھونپڑے کے عقب میں گھنی گھاس کی ایک چراگاہ تھی۔ کریانتو تین یا چار مرتبہ اس کے ہاں آیا۔ کبھی وہ دوپہر سے لے کر شام تک وہاں رہتا اور کبھی وہ صبح آ کر دوپہر کو چلا جاتا۔ ایسے موقعوں پر وہ سالی کو اسکی دادی کے پاس بھیج دیتی جو دریا کے پار رہتی تھی اور وہاں وُہ اپنے رشتے دار بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ وہ اور پولیس مین اکیلے رہ جاتے۔ کریانتو پُر جوش عاشق ثابت ہوا۔ وہ اس تعلق کو محبت کا رشتہ سمجھی۔ اُس کے لیے سبھی جذبے محبت سے عبارت تھے۔ حتیٰ کہ وہ حاملہ ہوگئی۔ وہ اپنے چوتھے مہینے میں تھی جب اُسے معلوم ہوا کہ کریانتو شہر چلا گیا ہے۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اُس کی سمجھ سے باہر تھا۔

ایک طویل جدائی کے بعد وہ دوبارہ اسی پُر ہجوم مارکیٹ میں ملے تھے لیکن کریانتو بہت بدل چکا تھا۔ اگنس نے اس تلخی کو اپنی ذات تک رہنے دیا۔

اب تاریکی اُتر رہی ہے۔ کھڑکی، جس کے پَٹ لکڑی کے ایک ٹکڑے پر ٹکے ہوئے تھے، کُھل گئی تھی اور اگنس اُس میں سے آس پاس کی چیزوں کے ہیولے دیکھ رہی تھی۔ کیلے کے درختوں کے ہیولے۔ پتے، تنے اور پھر اُس نے چھوٹے چھوٹے کیلوں کے گچھے کو دیکھا۔ اگنس نے سالی کو چاول پکانے کے لیے آواز دی۔ دوبارہ سہ بارہ کسی نے جواب نہ دیا۔

اگنس غصے میں آ کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے کھڑکی کے پَٹ کے نیچے رکھے لکڑے کے ٹکڑے کو اٹھا لیا۔ پٹ فوراً گر گئے۔ اُس کا بچہ، جسے بخار تھا، جاگ گیا اور رونے لگا۔ اگنس نے لعن طعن کرنی شروع کر دی۔

وہ بچے کے ساتھ لیٹ گئی اور اپنی چھاتی کو، جو پہلے سے برہنہ تھی، اُس کے منہ میں دے دیا۔ بچہ چُپ ہونے پر مجبور ہوگیا۔ وہ سانس بڑی مشکل سے لے رہا تھا لیکن اگنس چھاتی کو اُس کے مُنہ میں گھسیڑے رہی۔ اگنس نے اپنے بازو پر اُس کے بدن کی شدید گرمی کو محسوس کیا۔ یک دم اگنس کے دل میں جمع ساری تلخی اُبل کر باہر آ گئی۔ اُسے کریانتو یاد آیا، برانڈو یاد آیا۔

اُس کا خاوند برانڈ واب کہاں تھا؟ شاید ابھی تک پالا وان میں ۔ شاید اُس نے وہاں شادی کر لی ہے ۔ خدا کرے کر یسانتو پر بجلی گرے ، برانڈو پر بجلی گرے اور زندگی پر بجلی گرے ۔

''سالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سالی ۔'' اگنس کی آواز گونجی ۔'' تم کہاں ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری بچی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا ٹھہرو میں تمہیں مزا چکھاتی ہوں ۔ میں ذرا تمھیں پکڑ لوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمھاری چمڑی ادھیڑ دوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سالی ۔'' اگنس اُسے پکارتے بیزار ہو گئی ۔ پھر خاموشی چھا گئی ۔ صرف کیلوں کے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی جو ہوا چلنے سے ہلتے تھے ۔ اور اندر کوگون کی چھت کے پُرانے ٹکڑے آواز دے رہے تھے ۔ چھت اب گرنے ہی والی تھی ۔ کوگون گھاس کا ایک تنکا اگنس کے چہرے پر گرا ۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے ساتھ ہی ایک تنکا اُس کی ناک پر آ گرا ۔ ہوا ، اور دوپہر کی ہوا میں پتوں کی سرسراہٹ ۔ اگنس کے اُبلتے جذبات کی جگہ اب تنہائی نے لے لی تھی ۔ وُہ شفق کی نرم اور شفیق آوازوں کو سنتی رہی ۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اُس نے اُن میں اذیت کی چبھن محسوس کی ۔

شاید کچھ دیر کے لیے اگنس سو گئی تھی کیوں کہ ایک آواز سننے پر وہ بیدار ہو گئی ۔ نیچے سے ایک مردانہ آواز آ رہی تھی ۔ تھوڑی دیر کے لیے اگنس نے اپنے حواس جمع کیے ۔ یہ آواز اس کے لیے نئی تھی ۔ اُس نے اِسے پہلے کبھی نہیں سنا تھا ۔ یہ گہری اور رازوں سے بھری تھی ۔ اس آواز میں اس کے لیے کوئی عجیب سی چیز تھی ۔ اگنس بانس کے ٹھنڈے فرش سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ اُسے احساس ہوا کہ جھونپڑے کے اندر تو تاریکی چھا چکی ہے ۔ وہاں روشنی نہ تھی ۔ اُس نے تیل کے لیمپ کو تلاش کیا اور شہتیر پر رکھی ماچس کو ٹٹولا لیکن ڈبیہ بہت ہلکی تھی ۔ خالی ۔ بالآخر اُس نے پُرانا دروازہ کھول دیا ۔

''شام بخیر ، ڈے ۔'' نیچے سے آواز آئی ۔ مرد کے ایک ہاتھ میں سگرٹ جل رہا تھا جو اگنس نے دیکھ لیا ۔ وہ مرد کو گھورتی رہی لیکن اندھیرے میں صرف اُس کا ہیولی نظر آ رہا تھا ۔ وُہ درمیانے قد کا تھا ۔ اگنس نے جواب نہ دیا ۔ وُہ صرف مسکرائی اور اندھیرے میں مسکرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ اُس نے دیکھا کہ وہ شخص سیڑھیوں کے قریب آ رہا ہے ۔ اُس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر جھونپڑے کے اندر جھانکا ۔ اگنس کا ایک ہاتھ دروازے کے ایک حصے پر بوجھ ڈال رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وُہ اپنا سگرٹ تھامے اُسے اوپر کر رہی تھی ۔

''میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں ، ڈے ، کیا تم ٹیوانچو نگ کو جانتی ہو ۔ انچو نگ

لپس۔''اس آدمی نے پوچھا۔

''اچھا، وہی ٹیوانچو نگ جو میا نگ کا گھر والا ہے؟''

''ہاں۔''

''وہ تو کہیں اوپر رہتے ہیں۔''

''کتنی دور؟''

''پانچ کلومیٹر۔''

''اور اگر سڑک کے راستے نہ جائیں تو؟'' مرد نے اپنا سگرٹ پھینک دیا۔

''یہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر دریا کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹے رستے سے چلے جاؤ۔ پھر پہاڑوں اور میدان میں چلتے جاؤ اور راستے میں پُوچھتے جاؤ۔ بہتر ہوگا اگر کوئی تمھیں وہاں لے جائے۔ کیا تم تنہا ہو؟'' میں ابھی شہر سے آ رہا ہوں۔ ہم نے اس کی زمین کے سلسلے میں آپس میں کوئی معاملہ طے کرنا ہے۔ تمھارا بہت بہت شکریہ، ڈے، میں چلتا ہوں۔''

وُہ آدمی جانے کے لیے مُڑا اور جب اگنس نے یہ دیکھا تو ایک سوئی اُس کے دل کو چھیدنے لگی۔

''کیا آپ اندر نہیں آئیں گے، جناب؟''

وہ ٹھہر گیا۔''مجھے جانا ہے۔ ہاں، کیا پانی مِل سکتا ہے؟ کہیں پیاس راستے میں مجھے تنگ نہ کرے۔''

اگنس نے قدم اندر بڑھاتے ہوئے کہا۔''تھوڑی دیر کے لیے اوپر آ جائیں جناب۔''

اندر تاریکی جھونپڑے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ مرد نے دروازے میں جھانکا۔ اُس نے اپنے دونوں بازو سب سے اوپر والے تختے پر رکھے۔

''معاف کیجئے جناب، صرف ایک منٹ میں مٹی کے تیل کا لیمپ جلاتی ہوں۔''

اگنس نے جھوٹ بولا۔ مرد نے اپنی قمیض کی جیب میں سے ماچس نکالی اور ایک تیلی جلائی۔ جھونپڑے کا اندرونی حصہ مدھم روشنی میں واضح ہونے لگا۔ ہوا کے جھونکے نے لرزتے ہوئے شعلے کو بجھا دیا۔

''ڈے، یہ ماچس ہے۔ لگتا ہے تمھیں مُشکل پیش آ رہی ہے۔ لیمپ یہاں لے آؤ۔''

''نہیں کوئی مُشکل نہیں۔''

مرد اب سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ سب سے اوپر والے زینے پر بیٹھ گیا۔ اگنس نے اُسے لیمپ دیا جسے اُس نے روشن کر دیا۔

''میری ڈبیا بالکل خالی تھی۔'' اگنس نے کہا۔

ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور لیمپ بھی گُل ہو گیا۔ اُس لمحے اگنس جھونپڑے کے کونے کی طرف چل پڑی تھی جہاں چولہے کے نزدیک مٹی کا برتن پڑا ہوا تھا۔ وہ برتن کا ڈھکنا اتار کر پانی نکالنے لگی۔ وہ واپس آئی تو وہ مرد بے ڈھنگے پن سے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ہوا کو روکنے کے لیے دروازہ بند کر دیا تھا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی۔

''تم اپنے بچے کے ساتھ یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

لیمپ کے نسبتاً بڑے شعلے میں وہ مرد کا جسم زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے ایک سفید قمیض اور جُوتے پہن رکھے تھے۔ بال فوجی طرز کے کٹے ہوئے تھے۔ وہ درمیانی عمر کا تھا یعنی چالیس کے قریب۔ بے شک نوجوان نہیں تھا لیکن اب بھی خوش شکل تھا۔ اُس کے کندھے چوڑے اور ناک اونچی تھی۔ جب اگنس نے اسے پانی کا پیالہ پکڑایا اُس کی گہری اور کُھب جانے والی نگاہ اگنس کو متاثر کر گئی۔ مرد نے پانی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ اگنس اُس کے گلے کے ہلنے سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ اُس کے خیال میں یہ شخص خاصا کھاتا پیتا تھا۔ وہ خوش لباس اور خوش اخلاق تھا اور بقول اُس کے وُہ ٹیوانچونگ کی زمین کے سلسلے میں آیا تھا۔

مرد نے خالی پیالہ اگنس کو تھما دیا۔ ''ڈے، تمھارا بہت بہت شکریہ۔ تمھارے علاقے کا پانی بہت میٹھا ہے۔'' اگنس مسکرائی۔ ''اور تمھارا خاوند، وہ کہاں ہے؟''

''قریب ہی ٹیو باسٹینڈ ہے، وہیں ہو گا'' اُس نے پھر جھوٹ بولا۔

مرد نرمی سے ہنسا۔ اُس کے رخساروں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے نمودار ہوئے۔

''تو فارم میں اس طرح ہوتا ہے۔'' اگنس بچے کے قریب بیٹھ گئی۔ اُس نے پیالہ اپنے پاؤں کے قریب رکھا۔ ''تمھارا محافظ تو سو چکا ہے۔'' مرد نے کہا۔

''اِسے بخار ہے اس لیے۔''

''شاید یہ دانت نکال رہا ہے اس لیے۔''

''شاید'' اگنس نے ہتھیلی بچے کے ماتھے پر رکھ کر کہا۔

''اس کی عمر کیا ہے؟''

''تقریباً چھ ماہ۔''

اُن کے درمیان خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ ایک کڈھب خاموشی کا وقفہ۔ اگنس نے محسوس کیا کہ مرد اُس کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اُس نے آہستہ سے اپنی ٹھوڑی اُٹھائی۔ اپنے ساتھی کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اُس نے محسوس کیا اُس کا بدن ہولے ہولے پھنکنے لگا ہے۔

مرد نے حرکت کی۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ اُس نے ایک ہاتھ دروازہ کھولنے کے لیے اُٹھایا۔ اگنس کے دل کو جیسے کسی نے مسل کر رکھ دیا۔

''تو ڈے، میں اب زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔'' اُس نے کہا،''ایک بار پھر بہت بہت شکریہ۔''

''ہاں'' اگنس نے کہا۔ بعد میں وُہ اس پر بہت پچھتائی۔ مرد دروازہ کھول چکا تھا۔ اگنس نے اس کی چرچراہٹ سُنی۔ اُسے کچھ کھودینے اور ناکامی کا شدید احساس ہوا۔ مرد سیڑھیوں کے عین اوپر کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ اور آدھا جسم باہر کی تاریکی میں گُم ہو چکا تھا

''جناب'' یہ لفظ کہتے ہوئے اگنس کا گلا رُندھ گیا۔ اُس کی کانپتی ہوئی مدھم آواز صاف سُنی جا سکتی تھی۔

مرد ایک دم مڑا۔ اگنس ابھی تک فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی گود کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ اُس نے اپنے کپڑے اُتار دیے اور اجنبی کے سامنے برہنہ ہوگئی۔ اُس کی چھاتیاں اور جسم کا بالائی حصہ نظر آنے لگا۔

اگنس نے مرد کی طرف دیکھا۔ اُس نے دوبارہ اُسے پکارا۔ مرد نے اگنس کی طرف دیکھا لیکن حرکت نہ کی۔ اگنس کے ہونٹ اذیت سے کُھل گئے۔''میرے پاس آجاؤ۔۔۔ کیا تم سمجھ نہیں سکتے؟ میرا کام تو بس۔۔۔۔۔''

اگنس کی آواز میں طلب تھی۔

مرد بالآخر اگنس کے قریب آیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیے لیکن اُس میں کوئی گرمی نہیں تھی۔ اگنس نے اپنا چہرہ مرد کے سینے میں چھپالیا۔ اُس کے بازو اُس کی گردن میں حمائل ہوگئے۔ اُس کا سانس بھاری ہو رہا تھا اور دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک بھنور کی طرف کھنچ رہی تھی لیکن ان سب کے درمیان میں وہ اُس کے ہاتھ کو ایک مضبوط سرد دیوار کی طرح محسوس کر سکتی تھی۔

آخر کار مرد نے اپنی گردن سے اگنس کے ہاتھ ہٹائے۔ اُس نے آہستہ سے عورت کو اپنے سے جدا کیا۔ ''تمھارا بچہ۔'' مرد نے دھیمی آواز میں اُسے یاد دلایا۔ اگنس نے اپنی برہنگی چھپانے کے لیے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے ''تمھارا بچہ''۔ اُس نے دہرایا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور رات کے اندھیرے میں سیاہ پڑ چکی سڑک پر پہنچ گیا۔

ہیاشی فیومیکو
(جاپان)

ٹوکیو

اُس دوپہر ٹھنڈ اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ رِیو اپنا رَک سیک اُٹھائے تیزی سے گلی میں چلتی جا رہی تھی۔ وہ اُس جانب ہو کر چلتی تھی جدھر زرد سورج دفاتر کی عمارتوں کی چھتوں پر چمکتا تھا۔ کبھی کبھی وُہ اِدھر اُدھر پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتی، کسی عمارت، پارک کی ہوئی کار اور ٹوکیو شہر میں بکھری ہوئی بے شمار جگہوں میں سے ایک کو جہاں بم گرے تھے۔ ایک اشتہاری بورڈ کے اُوپر سے دیکھتے ہوئے زنگ آلود لوہے کا ایک ڈھیر اُس کی نظروں کے سامنے آیا جس کے ساتھ شیشے کے دروازے والا ایک کیبن تھا۔ اندر آگ جل رہی تھی اور اُس کی آتشیں بڑبڑاہٹ وہاں تک آ رہی تھی جہاں رِیُو کھڑی تھی۔ کیبن کے ساتھ اوور آل پہنے ایک آدمی کھڑا تھا اور اس کے سر پر ایک سُرخ رومال بندھا ہوا تھا۔ اُس شخص کی شخصیت میں ایک خوشگوار تاثر تھا اور رِیو نے ہمت کر کے اُسے پُکارا:

''میں چائے فروخت کرتی ہُوں۔ کیا آپ چائے خریدنا پسند کریں گے؟''

''چائے؟'' اُس شخص نے کہا۔

''جی ہاں''۔ رِیو کی مسکراہٹ میں گھبراہٹ عیاں تھی۔ ''شیزوکا چائے''۔

وہ اندر داخل ہوگئی اور رَک سیک کیبن کے قریب رکھ کر اس کی پیٹی کھول دی۔ اندر لوہے کے ایک سٹوو میں آگ جلتی نظر آ رہی تھی اور اُس پر ایک کیتلی سلاخ کے ساتھ لٹکی تھی۔ کیتلی

کی تھوتھنی میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

''معاف کیجئے گا'' رِیو نے کہا ''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں اندر آ کر آپ کے سٹو و کی مدد سے اپنے آپ کو کچھ گرم کرلوں؟ باہر تو قلفی جم رہی ہے اور میں کئی میل پیدل چل کر آ رہی ہوں''۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں'' اندر آ جاؤ''۔ اُس شخص نے کہا۔ ''دروازہ بند کر کے اپنے آپ کو گرم کرلو''۔

اُس نے سٹول کی جانب اشارہ کیا جو اُس کیبن کا اکلوتا فرنیچر تھا اور خود ایک پیٹی پر بیٹھ گیا۔ ریو ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔ پھر اُس نے اپنا رُک سیک کیبن کے اندر گھسیٹا اور سٹو و کے اوپر جھک کر اپنے ہاتھ آگ کی جانب بڑھا دیے۔

''تم اُس سٹول پر زیادہ آرام سے بیٹھ سکو گی''۔ اُس شخص نے کہا اور اُس کے دلفریب چہرے کی طرف دیکھا جو آگ کی تمازت سے سُرخ ہو رہا تھا اور اُس کے لباس پر بھی اُس کی نظر گئی جو بہت ہی معمولی قسم کا تھا۔

''مُجھے یقین ہے تم عام حالات میں یہ کُچھ نہ کرتیں ۔۔۔۔ یہی ۔۔۔۔۔۔ دربدر چائے فروخت نہ کرتیں۔''

''جی میں تو اسی طور روزی کماتی ہوں''۔ ریو نے کہا۔ ''مجھے بتایا گیا تھا یہ بہترین علاقہ ہے لیکن میں آج صُبح سے یہاں پیدل چل رہی ہوں اور صرف ایک پیکٹ چائے بیچ سکی ہوں۔ میں تو اب گھر جانے کی تیاری میں ہوں لیکن میں نے سوچا کہ راستے میں دوپہر کا کھانا کھاتی چلوں''۔

''تم یہاں رُک کر اپنا کھانا کھا سکتی ہو''۔ اُس شخص نے کہا۔ ''اور تم اپنی چائے کے بارے میں فکر نہ کرو''۔ اس نے مسکراتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''یہ تو قسمت کی بات ہے، ہوسکتا ہے کل تمھاری قسمت پھر سے جاگ اُٹھے''۔

کیتلی نے سیٹی بجا کر پانی اُبلنے کا اعلان کیا۔ اُس آدمی نے جب کیتلی کو سلاخ سے اُتارا تو ریو نے کیبن کا جائزہ لیا۔ چھت کالک سے سیاہ ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس ایک بلیک بورڈ دھرا تھا۔ خاندانی دیوتاؤں کے لیے مخصوص شیلف پر سکا کی کے درخت کا گملا دھرا تھا۔ اُس شخص نے میز پر سے ایک ڈھیلا سا پیکٹ اُٹھایا اور اُسے کھول کر اُس میں سے مچھی کا ایک ٹکڑا نکالا۔

تھوڑی دیر بعد مچھلی کے پکنے کی مہک سارے کیبن میں پھیل گئی۔

''آؤ''۔ اُس شخص نے کہا، ''بیٹھ کر اپنا کھانا کھالو''۔

ریو نے رُک سیک میں سے اپنا لنچ بکس نکالا اور سٹول پر بیٹھ گئی۔

''چیزیں فروخت کرنا کوئی مزے دار کام نہیں، یا ہے؟'' اُس شخص نے کہا اور مچھلی کو پلٹنے لگا۔ ''اچھا یہ بتاؤ سوگرام چائے سے تم کیا کما لیتی ہو؟''

''اگر میں اِسے پینتیس ین میں بیچ لوں تو مجھے کچھ منافع ہوسکتا ہے لیکن جو لوگ مُجھے چائے بھیجتے ہیں وہ اس میں خراب چائے بھی ملا دیتے ہیں چنانچہ اگر مُجھے تیس ین بھی مل جائیں تو غنیمت ہے''۔ ریو کے لنچ بکس میں دو چھوٹی مچھلیاں تھیں جن پر اُبلے ہوئے جو لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ پھلیوں کا تھوڑا سا اچار تھا۔

اُس نے کھانا شروع کر دیا۔

''تم رہتی کہاں ہو؟'' اُس آدمی نے پُوچھا۔

''شِنایا کے ضلعے میں۔ دراصل مجھے ٹوکیو کے علاقے کا کُچھ پتہ نہیں۔ میں چند ہفتے پیشتر یہاں آئی ہوں اور جب تک کوئی بہتر جگہ نہ مل جائے ایک دوست کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

''مچھلی تیار تھی اُس نے اِسے دو حصوں میں تقسیم کیا اور آدھی ریو کو دے دی اور اس کے ساتھ ایک ٹرے میں کُچھ چاول اور آلو بھی ڈال دیے۔ ریو مسکرائی اور شکریہ ادا کرنے کے لیے تھوڑا سا جُھکی اور پھر اپنے رُک سیک میں سے چائے کا ایک لفافہ نکال کر اُس میں سے تھوڑی سی چائے ایک کاغذی رومال پر ڈال دی۔

''اسے کیتلی میں ڈال دیں''۔ اُس نے کہا اور چائے اُس کی طرف بڑھا دی۔

اُس نے اپنا سر ہلایا اور مسکرایا۔ اُس کے سفید دانت نظر آنے لگے۔

''نہ، نہ یہ تو بہت مہنگی ہے''۔

ریو نے جلدی سے ڈھکن اُٹھا کر چائے کیتلی میں ڈال دی اور اُسے اتنا وقت نہ دیا کہ وُہ اُسے روک سکے۔ ہنستے ہوئے وہ شخص شیلف کی طرف گیا اور وہاں سے چائے کی ایک پیالی اور ایک مگ اُتار لایا۔

''تمھارا خاوند کہاں ہے؟'' وُہ مگ اور پیالی کو پیٹی کے اوپر سجاتا ہوا بولا۔ ''تم شادی شدہ ہو ناں؟''

''ہاں بالکل ہوں۔ میرا خاوند ابھی تک سائبریا میں ہے۔ اسی لیے مجھے اس طرح کام کرنا پڑتا ہے''۔

ریو نے اپنے خاوند کے بارے میں سوچا جس کی پچھلے چھ برس سے کوئی خیر خبر نہ آئی تھی اور اب تو وہ اتنا دور دراز لگتا تھا کہ اُس کی شکل یا اس کی شناسا آواز کو یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور دینا پڑتا تھا۔ وہ ہر صُبح اکلاپے اور خالی پن کی کیفیت کے لیے بیدار ہوتی۔ کئی بار اُسے یوں لگتا جیسے اُس کا خاوند سائبریا کے برفانی ماحول میں منجمد ہو کر ایک بُھوت کا رُوپ اختیار کر چکا ہے۔ ایک بُھوت یا ایک پتلا اور سفید ستون یا پھر برفانی ہوا کا ایک سانس۔ اُن دنوں جنگ کے بارے میں کوئی بھی گفتگو نہیں کرتا تھا اس لیے اسے یہ بتاتے ہوئے بڑی شرم آتی تھی کہ اُس کا خاوند ابھی تک ایک جنگی قیدی ہے۔

''یہ تو بہت عجیب بات ہے''۔ اُس شخص نے کہا۔ ''درحقیقت تو یہ کہ میں خود بھی سائبریا میں تھا۔ میں دریائے آمور کے قریب تین برس تک لکڑیاں کاٹتا رہا تھا۔ میں تو ابھی مشکل سے پچھلے برس گھر واپس آیا ہوں۔ بس یہ تو قسمت کی بات ہے تمھارے خاوند کی یہ بدنصیبی ہے۔۔۔۔۔۔اور تمھاری بھی!''

''اچھا تو تم واقعی سائبریا سے واپس بھیجے گئے ہو۔ تم پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا''۔ ریو نے کہا۔

''اِس کا تو مجھے علم نہیں،'' اُس نے کندھے اچکائے، ''لیکن، جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو، میں ابھی زندہ ہوں۔''

ریو نے اپنا لنچ بکس بند کیا اور اس دوران میں اُس کو غور سے دیکھا۔ اِس شخص میں ایک ایسی سادگی اور سیدھا پن تھا کہ وہ اس کے ساتھ کُھل کر باتیں کرنا چاہتی تھی حالانکہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ وہ باتیں کرنے سے ہچکچاتی تھی۔

''تمھارے بچے ہیں؟'' اُس نے پُوچھا۔

''ہاں۔ ایک چھ سال کا بیٹا ہے۔ اُسے سکول جانا چاہیے لیکن یہاں ٹوکیو میں اُس کی رجسٹریشن کروانے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ یہ سرکاری کارندے لوگوں کی زندگیاں پیچیدہ بنانے کا فن جانتے ہیں''۔

اُس شخص نے اپنا رومال کھول کر پیالی اور مگ کو پونچھا اور بھاپ اُڑاتی چائے اُنڈیل

دی۔

''بڑی عمدہ چائے ہے''۔اس نے ایک پرشور چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''پسند آئی ہے؟ یہ بہترین کوالٹی تو نہیں ہے،تھوک میں دوسودس ین کی ایک کلو ہے لیکن تُم دوست کہتے ہو، یہ عمدہ ہے''۔

اُن کی گفتگو کے دوران میں ہوا میں تیزی آ چکی تھی اور کیبن کی ٹین کی چھت پر وہ سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ریو نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو گھر تک کی لمبی مسافت کے لیے تیار کر رہی تھی۔

''مجھے تمھاری چائے چاہیے ساڑھے سات سوگرام۔''اُس نے کہا اور اپنے اوور آل کی جیب میں سے سوسو کے مُڑے تُڑے دو نوٹ نکالے۔

''تم تو بیوقوفوں ایسی باتیں کرتے ہو''۔ریو نے کہا،''تم اِسے بالکل مُفت لے سکتے ہو۔''

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔یُوں نہیں چلے گا۔کاروبار آخر کاروبار ہے۔''اُس نے زبردستی پیسے اُسے تھما دیے۔

''اور اگر تم کبھی دوبارہ ادھر آؤ تو ذرا گپ شپ کے لیے آ جانا۔''

''میں آنا پسند کروں گی''۔چھوٹی سی کیبن پر نظر ڈالتے ہوئے ریو نے کہا۔

''لیکن تم یہاں تو نہیں رہتے؟''

''میں بالکل یہیں رہتا ہوں اور اس لوہے کی حفاظت پر مامور ہوں اور اِسے ٹرکوں پر لادنے میں مدد کرتا ہوں۔ میں تقریباً سارا دن یہیں ہوتا ہُوں۔''

اُس نے شیلف کے نیچے سے ایک دروازہ کھولا اور ایک چھوٹی سی ڈبہ نما جگہ میں ایک بستر بڑی صفائی سے بچھا دکھائی دیا۔ ریو نے دیکھا دروازے کی پُشت پر کسی اداکارہ کی رنگین تصویر چسپاں ہے۔

''تم نے تو بہت اچھا انتظام کیا ہوا ہے۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''تم تو یہاں خاصے آرام سے ہو۔۔۔۔۔نہیں؟''

پھر وہ اس کی عمر کے بارے میں سوچنے لگی۔

اُس روز کے بعد سے ریو باقاعدگی سے یوٹ سوگی چائے فروخت کرنے کے لیے

آنے لگی۔ اور ہر بار وہ بم کی جگہ پر بنی ہوئی کیبن میں ضرور آتی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس آدمی کا نام ٹسروشی یوشیو ہے۔ تقریباً ہر بار اُس کے پاس کوئی چھوٹی سی مزیدار شے ہوتی جو ریو کے لنچ بکس کے لیے ہوتی: آڑو کا اچار، بڑے گوشت کا ایک ٹکڑا، سارڈین مچھلی اور اسی قسم کی مزیدار چیزیں۔ ریو کا کاروبار بہتر ہونے لگا اور اس علاقے میں کئی لوگ اُس کے باقاعدہ گاہک بن گئے۔ اُس کی پہلی ملاقات کے پُورے ایک ہفتے کے بعد وہ اپنے لڑکے ریوکیچی کو ساتھ لے آئی۔ ٹسروشی نے تھوڑی دیر لڑکے کے ساتھ گپ شپ لگائی اور پھر اُسے سیر کے لیے لے گیا۔ وہ لوٹے تو ریوکیچی ایک بڑا کریمل کیک اُٹھائے ہوئے تھا۔

''تمھارے اس لڑکے کا معدہ بہت اچھا ہے''۔ ٹسروشی نے لڑکے کے چھوٹے چھوٹے بالوں پر تھپکی دے کر کہا۔

میرا یہ نیا دوست شادی شدہ ہے یا نہیں، اکثر ریو یہ سوچتی۔ یہی نہیں وُہ اُس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بھی غور کرتی رہتی۔ وہ انتیس برس کی ہو چکی تھی۔ یک دم اُسے احساس ہوا کہ اپنے خاوند کے بعد وہ پہلی مرتبہ کسی دوسرے مرد میں دلچسپی لے رہی ہے۔ ٹسروشی کو اپنی اس دلچسپی کے بارے میں خبر نہ ہونے دی۔

کچھ دنوں بعد ٹسروشی نے ریو اور یوکیچی کو چھُٹی کے روز اساکو سا دکھانے کی پیشکش کی۔ اُونو سٹیشن کے معلوماتی کھوکھے کے سامنے وہ ایک دوسرے سے ملے۔ ٹسروشی ایک پرانا سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا جو اب بہت تنگ ہو چکا تھا۔ ریو نے کیمونو کا نیلے رنگ کا لباس اور اُس پر ایک ہلکے بھُورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس عام اور سستے لباس کے باوجود اُس پُر ہجوم سٹیشن میں کھڑے ہوئے وہ بہت نوجوان اور باوقار لگ رہی تھی۔ دراز قامت اور بھاری تنوتوش کے مالک ٹسروشی کے ساتھ وُہ سکول کی بچی لگ رہی تھی جو چھٹیاں منانے جا رہی ہو۔ اُس کے شاپنگ بیگ میں اُن کا دوپہر کا کھانا تھا۔ روٹی، مالٹے اور چاولوں سے بھری ہوئی سمندری گھاس۔

''اُمید تو ہے کہ آج بارش نہیں ہوگی''۔ ٹسروشی نے کہا اور ریو کی کمر کے گرد اپنا بازو ڈال کر اُسے ہجوم سے باہر لے جانے لگا۔

اُنھوں نے اساکوسا سٹیشن کے لیے زیرِ زمین گاڑی پکڑی۔ پھر پیدل چلتے ہوئے ماتسویا ڈیپارٹمنٹ سٹور سے سینکڑوں چھوٹے سٹالوں سے گزرتے ہوئے نِتن شِنتو گیٹ تک پہنچے۔

اسا کوسا کا ضلع ریو کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ جب ٹسروشی نے ایک سُرخ مندر کی جانب اشارہ کر کے اُسے بتایا کہ یہ اسا کوسا کی رحم کی دیوی کا گھر ہے تو وہ بے حد حیران ہوئی۔ دُور سے بگل اور سیکسا فون کی آواز آ رہی تھی جو لاؤڈ سپیکر کے ذریعے ان تک پہنچ رہی تھی۔ یہ آوازیں سکا کی کے قدیم درختوں میں سے گزرتی ہوا کے ساتھ مل کر عجیب تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

وہ پُرانے کپڑوں کی منڈی کے راستے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں خوراک کے سٹالوں کی ایک قطار تھی جو اسا کوسا تالاب کے کنارے ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے کھڑے تھے۔ یہاں فضا میں تیل کے جلنے کی بُو تھی۔ ٹسروشی نے ایک سٹال سے ریو کیچی کے لیے زرد میٹھی روٹی خریدی۔ وہ تینوں ایک تنگ گلی میں چل رہے تھے جس کے دونوں جانب امریکی طرز کے اشتہاری بورڈ لگے ہوئے تھے جو ریستورانوں اور فلموں کے بارے میں تھے۔ لڑکا روٹی پر منہ مارتا مزے سے ساتھ چل رہا تھا۔ ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا جب ریو نے ٹسروشی کو پہلی بار اُس کے کیبن کے باہر دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود وُہ اُس کی رفاقت میں یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اُسے ایک عرصے سے جانتی ہو۔

''تو آخر کار بارش شروع ہو ہی گئی''۔ اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ریو نے اوپر دیکھا تو سلیٹی رنگ کے آسمان سے بارش کے اِکا دُکا قطرے گر رہے تھے۔ ''ہماری قیمتی پکنک برباد ہو جائے گی''۔ اُس نے سوچا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم اُس دکان کے اندر چلے جائیں''۔ ٹسروشی نے ایک ایسی دوکان کی طرف اشارہ کیا جس کے باہر ایک شوخ لالٹین لٹک رہی تھی اور اُس پر ''مَیری ٹی ہاؤس'' کے الفاظ لکھے تھے۔ جس میز پر وُہ بیٹھے اُس کے اوپر چھت پر مصنوعی چیری کے شگوفے سجے ہوئے تھے۔ یہ جگہ ان کے مزاج کی ہرگز نہ تھی لیکن وہ ایک اچھا دن گزارنے پر تلے ہوئے تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ ریو نے اپنی روٹی، مالٹے اور بھری ہوئی سمندری گھاس تقسیم کی۔ اُن کا کھانا بہت جلد ختم ہو گیا اور اس دوران میں تیز بارش تیز تر ہو گئی۔

''جب تک یہ رک نہیں جاتی ہم یہیں انتظار کر لیں تو بہتر ہے''۔ ٹسروشی نے مشورہ دیا۔ اِس کے بعد میں تمھیں گھر لے جاؤں گا''۔

ریو کے ذہن میں آیا کہ پتا نہیں وہ اپنے گھر کے بارے میں کہہ رہا ہے یا میرے گھر کے بارے میں۔ وُہ اپنے آبائی قصبے کی ایک دوست کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی اور اُس کے پاس تو

ایک کمرہ بھی نہ تھا جسے وُہ اپنا کہہ سکتی ۔ وہاں جانے کی بجائے بہتر تھا وُہ ٹسروشی کے کیبن میں واپس چلے جاتے ، لیکن وُہ بھی اتنا بڑا نہیں تھا کہ اُس میں تین شخص سما سکتے ۔ اپنا بٹوہ نکال کر اُس نے میز کے نیچے چوری چُھپے اپنے پیسے گنے ۔

سات سوین میں چند گھنٹوں کے لیے کسی سرائے کی چھت تلے پناہ لی جاسکتی تھی ۔

''تم جانتے ہو میں کیا پسند کروں گی ؟'' اُس نے کہا ۔ ''ہم تو پہلے تو کوئی فلم دیکھیں گے ، پھر جدا ہونے سے پہلے کسی سرائے میں جا کر کچھ کھائیں پییں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس سب پر خرچ کافی ہوگا'' ۔

''تم ٹھیک کہتی ہو'' ۔ ٹسروشی نے ہنستے ہوئے کہا ۔ ''لیکن پھر بھی ہم ایسا ہی کریں گے'' ۔ اُس نے اوورکوٹ اُتار کر ریوکیچی کے سر پر ڈال دیا اور برستی بارش میں بھاگتے ہوئے ایک سینما گھر کی طرف چلے گئے ۔ وہاں کوئی بھی نشست خالی نہ تھی ۔ بہر حال کھڑے ہو کر فلم دیکھتے دیکھتے لڑکا ٹسروشی کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے گہری نیند سو گیا ۔ سینما گھر کے اندر فضا ہر لحظہ گرم اور بھاری ہوتی جا رہی تھی اور چھت پر بارش کے برسنے کی آواز بھی آ رہی تھی ۔ سینما گھر سے باہر نکلے تو تاریکی چھا چکی تھی اور بارش یوں شور مچاتی برس رہی تھی جیسے تیز ہوا میں کیلے کے پتے سرسراتے اور شور مچاتے ہیں ۔ بالآخر اُنھیں ایک سرائے مل گئی اور اُس کے مالک نے انھیں ایک ہوادار راہداری میں سے گزار کر ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جس میں قالین بچھا ہوا تھا ۔ ریو نے اپنی گیلی جرابیں اُتار دیں ۔ لڑکا ایک کونے میں جا بیٹھا اور پھر سو گیا ۔

''یہ لو ۔ اِسے بطور تکیہ استعمال کیا جا سکتا ہے'' ۔ ٹسروشی نے ایک کُرسی کی گدی اُٹھا کر ریوکیچی کے سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا ۔

کسی لبریز گٹر میں سے پانی نکل نکل کر صحن میں ایک ندی کی صُورت مسلسل گر رہا تھا ۔ اِس کی آواز کسی دور افتادہ کوہستانی گاؤں میں گرنے والی آبشار کی مانند تھی ۔

ٹسروشی رومال نکال کر ریو کے بھیگے ہوئے بالوں کو صاف کرنے لگا ۔ خوشی کی ایک کیفیت اُس کے بدن میں پھیلتی گئی ۔ لگتا تھا جیسے بارش نے کئی برسوں سے اس کے اندر جمع ہوتی رہنے والی تنہائی کو دھو دیا تھا ۔

وُہ خوراک کے بارے میں پتا کرنے کے لیے باہر نکلی تو راہداری میں ایک ایسی ملازمہ سے ٹکرا گئی جو مغربی لباس پہنے تھی اور چائے کی ایک ٹرے اُٹھائے چلی جا رہی تھی ۔ ریو نے

موٹی سویوں کے دو پیالوں کا آرڈر دیا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔تھوڑی دیر بعد ٹسروشی ریو کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے وہ تاریک اور بارش سے بھرے آسمان کو دیکھتے رہے۔

''تمھاری عمر کیا ہے ریو''۔ٹسروشی نے اُس سے پوچھا''میرا خیال ہے کہ پچیس برس کے قریب؟''ریو ہنسنے لگی۔''نہیں ٹسرو، میں تو بوڑھی ہو چکی ہوں،تقریباً اٹھائیس برس کی''۔

''اچھا! تو تم مُجھ سے ایک سال بڑی ہو''۔

''حیرت ہے تم مجھ سے چھوٹے ہو''۔ریو نے کہا،''میرا تو خیال تھا کم از کم تیس برس کے ہو گے''۔

اُس نے اُس کی سیاہ اور نرم آنکھوں میں دیکھا جن کی بھنویں بے حد گھنی تھیں۔لگتا تھا وُہ ذرا شرما رہا ہے۔پھر وُہ جُھکا اور اپنی گیلی جرابیں اُتارنے لگا۔

بارش رکے بغیر جاری رہی۔اس دوران ملازمہ ٹھنڈی سویاں اور سوپ لے کر آئی ریو نے اپنے بیٹے کو جگا کر اسے سُوپ کی ایک پلیٹ دی۔وُہ اُس کی چُسکیاں لیتے ہوئے بھی تقریباً سو رہا تھا۔

''ریو''۔ٹسروشی کہنے لگا،''یہ بہتر ہے کہ ہم رات اِسی سرائے میں گزار لیں۔تم اتنی شدید بارش میں گھر کیسے جا سکتی ہو؟''

''ہاں،''ریو نے کہا،''تم درست کہتے ہو''۔

ٹسروشی کمرے سے باہر گیا اور جب واپس آیا تو اُس کے پاس بہت ساری رضائیاں تھیں جو اُس نے فرش پر بچھا دیں۔یک دم ایسا محسوس ہوا جیسے سارا کمرہ بستروں سے بھرا ہوا ہے۔ریو نے اپنے بیٹے کو ایک رضائی میں لپیٹ کر تھپکی دی۔

وہ گہری نیند سو رہا تھا۔پھر اُس نے روشنی گُل کر کے کپڑے اُتارے اور لیٹ گئی وُہ ٹسروشی کے لیٹنے اور کپڑے بدلنے کی آواز سُن رہی تھی۔

''میرا خیال ہے ان سرائے والوں کا تو یہی خیال ہو گا کہ ہم شادی شدہ ہیں''۔ تھوڑی دیر بعد ٹسروشی نے کہا۔

''ہاں شاید۔۔۔۔انھیں یُوں بیوقوف بنانا کوئی اچھی بات تو نہیں''۔

اُس نے یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن اب جب وُہ رضائی میں بے لباس لیٹی تھی اُس

نے پہلی بار اپنے آپ کو کچھ مُجرم سا محسوس کیا۔ کسی وجہ سے اُسے اُس کا خاوند کئی برسوں بعد اس قدر قریب لگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہاں صرف اس لیے تھی کہ بارش شروع ہوگئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کے خیالات اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے اور وہ سو گئی۔

جب وہ بیدار ہوئی تو ابھی بھی اندھیرا تھا۔ اس نے سنا ٹسروشی نیند میں اس کا نام دوہرا رہا تھا۔ اسے ایک دھچکا سا لگا اور وہ اُٹھ بیٹھی۔

''ریو، کیا تھوڑی دیر کے لیے میں تمھارے پاس آ سکتا ہوں؟ کُچھ باتیں کرنے کے لیے؟''

''نہیں ٹسرو۔۔۔۔۔'' اُس نے کہا، ''تمھیں نہیں آنا چاہیے''۔

چھت پر بارش ابھی تک برس رہی تھی لیکن طوفان کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔ گٹر سے ایک چھوٹی سی لکیر صحن میں گر رہی تھی۔ بارش کی آواز میں اُس نے شاید ٹسروشی کو ایک ٹھنڈی سانس بھرتے سُنا۔

''دیکھو ٹسرو'' اُس نے وقفے کے بعد کہا، ''میں نے تم سے آج تک نہیں پُوچھا لیکن کیا تم شادی شدہ ہو!''

''نہیں، اب نہیں''۔ ٹسروشی نے کہا۔

''پہلے کبھی؟''

''ہاں میں پہلے شادی شدہ تھا جب میں فوج سے واپس آیا تو مُجھے معلوم ہوا کہ میری بیوی کسی اور مرد کے ساتھ رہ رہی ہے''۔

''کیا تمھیں۔۔۔۔ غصہ آیا تھا؟''

''ہاں۔۔۔۔ مُجھے غصہ آیا تھا لیکن میں اس سلسلے میں کر بھی کیا سکتا تھا۔۔۔۔ اُس نے مُجھے چھوڑ دیا تھا اور بس یہی کُچھ ہونا تھا''

وُہ چُپ ہو گئے۔

''ہم کس چیز کے بارے میں گفتگو کریں؟'' ریو نے پُوچھا

ٹسروشی ہنسنے لگا: ''کوئی ایسی خاص چیز تو نہیں ہے جس کے بارے میں ہم گفتگو کر سکیں۔ وُہ سویاں زیادہ اچھی نہیں تھیں یا اچھی تھیں؟''

''نہیں اُنھیں اچھا تو بالکل نہیں کہا جا سکتا اور انھوں نے ہم سے ایک سو ین فی پلیٹ

چارج کیے''۔

''کیا ہی اچھا ہوا اگر تم دونوں کے پاس اپنا ایک کمرہ ہو''۔ٹسروشی نے کہا۔

''پھر تو ہمارے بھی ٹھاٹھ ہوں۔کیا ہم تمھارے قریب کوئی کمرہ حاصل کر سکتے ہیں؟ میں تمھارے آس پاس رہنا پسند کروں گی،ٹسرو!''

''ان دنوں کمرے حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے، خاص طور پر شہر میں لیکن میں خیال رکھوں گا اور تمھیں اطلاع کر دوں گا۔ ریو تم واقعی قابلِ تعریف ہو''۔

''میں؟'' ریو ہنسنے لگی۔''بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو''۔

''ہاں تم بہت ہی شاندار اور حیرت انگیز عورت ہو''

ریو فرش پر لیٹ گئی۔ یکدم اُس کا جی چاہا کہ وُہ ٹسروشی کو بازوؤں میں جکڑ لے تاکہ اُس کے بدن کا قرب محسوس کر سکے۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ بولتی تو اُس کی خواہش بولنے لگتی۔ وہ سانس بھی مشکل سے لے رہی تھی۔ اُس کا پُورا بدن کھنک رہا تھا۔کھڑکی سے باہر صُبح کا پہلا ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا گزر گیا۔

''تمھارے والدین کہاں ہیں،ٹسرو؟''' تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

''فلوکا کے نزدیک ایک جگہ''۔

''تمھاری ایک بہن ٹوکیو میں بھی تو ہے''۔

''ہاں۔ وہ بالکل تنہا ہے،تمھاری طرح۔اُس کے دو بچے ہیں۔''اُس کے پاس سلائی کی مشین ہے اور وُہ مغربی طرز کے ملبوسات بناتی ہے۔کئی سال پہلے اُس کا خاوند قتل ہو گیا تھا۔چین میں جنگ کے دوران۔ جنگ۔۔۔۔۔ ہمیشہ جنگ''۔

ریو کھڑکی سے صُبح کی اولین کرن نظر آنے لگی تھی۔ان کی ایک شب کی رفاقت بس ختم ہونے کو تھی۔اُس نے اداس ہو کر سوچا۔اُسے شاید اس بات کا افسوس تھا کہ ٹسروشی نے بہت آسانی سے ہتھیار ڈال دیے تھے لیکن پھر بھی وہ جانتی تھی کہ بہتری اِسی میں تھی۔ ہاں اگر وہ ایسا مرد ہوتا جس کے لیے وہ کچھ محسوس نہ کرتی یا اُسے بالکل نہ جانتی تو شاید وہ اپنے آپ کو بغیر کسی پچھتاوے کے اُس کے حوالے کر دیتی۔

ٹسروشی کے ساتھ معاملہ بالکل مختلف تھا۔۔۔۔۔ بالکل مختلف۔

''ریو۔۔۔۔مجھے نیند نہیں آرہی''۔اُس کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔''میں

جاگ رہا ہوں۔ دراصل مجھے اس قسم کی چیزوں کی عادت نہیں''۔

''کس قسم کی چیزوں کی؟''

''یوں کسی لڑکی کے ساتھ کسی کمرے میں سونا''۔

''ٹسرو۔۔۔۔۔۔ یہ تو نہ کہو کہ تم کبھی کسی لڑکی کے ساتھ وقت نہیں گزارتے''۔

''صرف کاروباری لڑکیوں کے ساتھ''۔

ریو ہنسنے لگی۔''مردوں کے لیے بہت ساری آسانیاں ہیں''۔

اُس نے ٹسروشی کو حرکت کرتے سُنا۔ یک دم وُہ اُس کے ساتھ تھا۔ اُس کے اُوپر جُھکا ہوا۔ ریو نے بالکل حرکت نہ کی۔ جب اُس کے بازو اُس کے گرد لپٹے تب بھی وُہ خاموش رہی۔ اُس کا چہرہ اُس کے چہرے کو چھو رہا تھا۔ تاریکی میں اُس کی آنکھیں پُوری کی پُوری کھلی تھیں اور اُن کے سامنے تیز روشنیاں چمکتی تھیں۔ اُس کے گرم ہونٹ اُس کے رخساروں پر تھے۔

''ریو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ریو''

''یہ بات غلط ہے'' اُس نے سرگوشی کی،''یہ میرے خاوند کے ساتھ زیادتی ہے۔''

لیکن اُسی لمحے اُسے اپنے لفظوں پر افسوس ہوا۔ ٹسروشی اُس پر جُھکا تو روشن ہوتے آسمان کے پس منظر میں اُس کی شباہت دکھائی دی۔ وہ آگے کو اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے کسی دیوتا کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہے۔ ریو نے ایک لمحے کے لیے تامّل کیا اور پھر دہکتے ہوئے بازو اُس کی گردن میں ڈال دیے۔

دو روز بعد ریو بیٹے کو لیے ٹسروشی سے ملنے گئی۔ جب وُہ اُس مقام پر پہنچی جہاں بم گرا تھا تو اُسے دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ وُہ سر پر سُرخ رومال باندھے اپنے کیبن کے سامنے نہیں تھا۔ ریو کیچی یہ جاننے کے لیے کہ وہ کیبن میں ہے یا نہیں بھاگتا ہوا گیا اور اُسی لمحے واپس آ گیا۔

''وہاں تو اجنبی لوگ ہیں۔۔۔۔۔ ماں!''

ہراساں ہو کر وہ تیزی سے کیبن کی طرف گئی اور اندر جھانکا۔ دو مزدور ٹسروشی کا سامان ایک کونے میں ڈھیر کر رہے تھے۔

''کیا بات ہے خاتون؟'' اُن میں سے ایک نے گردن مُوڑ کر پُوچھا۔

''میں ٹسروشی کو تلاش کر رہی ہوں''۔

''تمھیں علم نہیں کہ۔۔۔۔۔۔ ٹسروشی کل مر گیا تھا؟''

''مر گیا؟'' اُس نے کہا۔ وُہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن لفظ اُس کے مُنہ سے نکل نہیں رہے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ خاندان کے دیوتاؤں کے شیلف پر ایک موم بتی روشن تھی اور اب اُسے معلوم ہوا کہ ایسا کیوں تھا۔

''ہاں''۔ مزدور کہنے لگا۔ ''وہ پچھلی شب آٹھ بجے کے قریب مارا گیا۔ وُہ لوہے کی سلاخیں پہنچانے کے لیے ایک شخص کے ساتھ ٹرک میں اُمیا گیا اور واپسی پر ایک تنگ پُل پر اُن کا ٹرک اُلٹ گیا۔ وہ اور ڈرائیور دونوں ہلاک ہو گئے۔ اُس کی بہن کمپنی کے افسران کے ہمراہ آج اُمیا گئی ہے تا کہ اُسے جلانے کا بندوبست کر سکے''۔

ریو نے خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھا اور خالی نظروں سے اُن دونوں مزدوروں کو ٹسروشی کا سامان ڈھیر کرتے دیکھتی رہی۔ شیلف پر روشن موم بتی کے ساتھ چائے کے دو پیکٹ پڑے تھے۔ وُہی پیکٹ جو اُس نے ریو سے خریدے تھے۔ کیا یہ صرف دو ہفتے پہلے کی بات ہے؟ اُن میں سے ایک کُھلا ہوا تھا اور دوسرا بالکل بند تھا۔

''میرا خیال ہے آپ اُس کی دوست تھیں، کیوں خاتون؟ وہ بہت شاندار شخص تھا۔۔۔ٹسرو۔۔۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُسے اُمیا جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ڈرائیور کی طبعیت ٹھیک نہیں تھی چنانچہ ٹسرو کہنے لگا میں سامان اُتارنے کے لیے تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔۔۔۔۔ ہے نا پاگل پن۔۔۔۔ جنگ سے اور سائبیریا سے بچ کر آ گیا اور یہاں اس طرح مارا گیا''۔

ایک مزدور نے ایکٹرس کی تصویر اُتار کر اس پر پھونک مار کر گرد جھاڑی۔ ریو وہیں کھڑی ٹسروشی کے سامان کو دیکھتی رہی۔ کیتلی، فرائی پان، ربڑ کے جوتے اور جب اُس کی نظریں بلیک بورڈ پر پڑیں تو پہلی بار اُس نے اُس پر سُرخ چاک سے گھسیٹا ہوا ایک پیغام دیکھا،

''ریو۔۔۔۔۔ میں دو بجے تک تمھارا انتظار کرتا رہا۔۔۔۔۔۔ شام کو لوٹوں گا''۔

بے اختیار وہ دونوں مزدوروں کے سامنے جُھکی اور رک سیک کمر پر رکھ لیا۔ کیبن کو چھوڑتے ہوئے اُس کا بدن بے حِس ہو چکا تھا۔ ریو کیچی کا ہاتھ پکڑے جب وُہ اُس مقام پر آئی جہاں بم گرا تھا تو چلتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے اُبل پڑے۔

''کیا وہ آدمی مر گیا، ماں؟''

''ہاں وُہ مر گیا''۔ ریو نے کہا۔

ؤہ کیوں مر گیا؟''

''وہ دریا میں گر گیا تھا''۔

آنسواُس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ ؤہ بے احتیاط بہتے چلے جا رہے تھے اور ؤہ شہر کی گلیوں میں تیزی سے چلتی جاتی تھی۔ دریائے سمیدہ کے کمان جیسے پُل کو پار کر کے وہ ماکوہوکی جانب پیدل چلنے لگی۔

''اگر تم حاملہ ہو جاؤ تو فکر نہ کرنا''۔ ٹسروشی نے اساکوسا میں اُسے کہا تھا۔''جو بھی ہو میں تمھارا خیال رکھوں گا ریؤ''۔ اور اُس کے بعد جُدا ہونے سے پہلے اُس نے کہا تھا،''میرے پاس کچھ زیادہ پیسے نہیں ہیں لیکن تم مُجھے اپنی مدد کرنے دو۔ میں اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ دو ہزار ین تمھیں دے سکتا ہوں''۔ ؤہ ریوکیچی کو ایک ایسی دوکان میں لے گیا تھا جہاں غیر ممالک کا سامان فروخت ہوتا تھا اور اُسے بیس بال کی کیپ خرید کر دی تھی۔ کیپ پر اُس کا نام لکھا تھا۔ پھر ؤہ تینوں بے حد خوش گلیوں میں چلتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے جوہڑوں سے بچتے ہوئے، جو بارش کی وجہ سے سڑک پر بن گئے تھے۔ جب ؤہ ایک مِلک بار کے قریب پہنچے تھے تو ٹسروشی انھیں اندر لے گیا تھا اور دونوں کے لیے دودھ کے بڑے گلاسوں کا آرڈر دیا تھا۔

اب اس تاریک دریا کی جانب سے ایک برفیلی ہوا آ رہی تھی۔ مرغابیوں کا ایک جھنڈ دوسرے کنارے پر کھڑا تھا منجمد اور بُرے حال میں۔۔۔۔ سامان ڈھونے والی کشتیاں دریا میں اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔

''ماں مجھے ڈرائنگ کی کاپی چاہیے۔۔۔۔۔ تم نے کہا تھا مُجھے لے دو گی۔''

''بعد میں۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد''۔

وہ بیرک نما عمارتوں کی ایک قطار کے قریب سے گزر رہے تھے۔ یہ ذاتی گھر ہوں گے، اُس نے سوچا ان میں جو لوگ رہتے ہیں اُن کے اپنے اپنے کمرے تو ضرور ہوں گے۔ ایک کھڑکی سے ایک رضائی لٹک رہی تھی اور اندر ایک عورت کمرے کی صفائی کرتی نظر آ رہی تھی۔

''چائے خرید یئے''۔ ریو نے آہستہ سے پکارا،''بہترین قسم کی شی زوکا چائے۔''

کوئی جواب نہ پا کر ریو نے اپنا فقرہ زور سے دہرایا۔

''مُجھے ضرورت نہیں ہے''۔ عورت نے کہا۔ اُس نے رضائی کھینچ کر اندر کی اور زور سے کھڑکی بند کر دی۔ ریو نے قطار کے ہر گھر میں آواز لگائی لیکن کسی کو بھی چائے کی ضرورت نہیں

تھی ۔ ریو کیچی اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور بڑبڑاتا رہا کہ میں تھک چکا ہوں ، میں بُھوکا ہوں ۔ ریو کا رُک سیک اُس کے کندھوں میں چُبھ رہا تھا اور اُسے اُس کی پٹی دُرست کرنے کے لیے اکثر رُکنا پڑتا ۔ اس کے باوجود اسے یہ جسمانی تکلیف اچھی لگ رہی تھی ۔

اگلے روز وُہ اکیلی شہر گئی اور یوکیچی کو گھر چھوڑ گئی ۔ جب وُہ اُس مقام پر پہنچی جہاں بم گرا تھا تو اُس نے دیکھا کہ کیبن کے اندر آگ جل رہی ہے ۔ وُہ بھاگتی ہوئی دروازے تک گئی اور اندر گھس گئی ۔ ٹسروشی کے چولہے کے قریب ایک بوڑھا آدمی مزدوروں کا اوورکوٹ پہنے بیٹھا تھا اور آگ میں لکڑیاں ڈال رہا تھا ۔ کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور کھلی کھڑکی سے دھواں باہر جا رہا تھا ۔

'' تم کیا چاہتی ہو؟ '' بوڑھے نے مڑ کر پوچھا ۔

'' میں شی زوکا چائے فروخت کرنے کے لیے آئی ہوں ۔ ''

'' شی زوکا چائے ؟ میرے پاس تو بہت اچھی چائے وافر مقدار میں موجود ہے ۔ ''

ریو بغیر کچھ کہے باہر آ گئی ۔ اُس نے سوچا تھا کہ وُہ ٹسروشی کی بہن کا پتا دریافت کرے گی اور وہاں جا کر اُس کی یاد میں ایک اگربتی جلائے گی لیکن اُسے یکلخت احساس ہوا کہ یہ سب کتنا فضول ہے ۔ وہ دریا کی طرف واپس آ گئی ۔ پانی پر پچھلے پہر کا سُورج چمک رہا تھا ۔ وہ بجری کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گئی ۔ کچھ فاصلے پر بلی کا ایک مردہ بچہ اوندھا پڑا تھا ۔ اُس کے ذہن میں ٹسروشی کا خیال آیا تو اُس نے سوچا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ کبھی نہ ملتے ۔ نہیں نہیں ، ہرگز نہیں ۔ اُسے کوئی پچھتاوا نہ تھا ۔ اُس سے ملنے یا اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا اُس کا ۔ اُسے اِس بات کا بھی کوئی دُکھ نہیں تھا کہ وہ ٹوکیو کیوں آئی تھی ۔ جب وُہ ایک ماہ پیشتر یہاں آئی تھی تو اُس نے کاروبار کی ناکامی کی صورت میں واپس جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن اب وُہ جانتی تھی کہ وُہ ٹوکیو میں ہی رہے گی ، بلکہ شاید اسی جگہ ، اسی علاقے میں جہاں ٹسروشی رہا کرتا تھا ۔ وُہ اُٹھ کھڑی ہوئی رُک سیک کندھوں پر اٹھایا اور پھر سے دریا سے پرے ہونے لگی ۔ جب وُہ ایک چھوٹی گلی میں گھوم رہی تھی تو اُس نے ایک جھونپڑا دیکھا جو لکڑی کے چند تختے جوڑ کر بنایا گیا تھا ۔ وُہ دروازے کے قریب گئی اور پکاری '' چائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چائے چاہیے؟ '' دروازہ کُھلا اور ایک ایسی عورت باہر نکلی جس کا لباس ریو سے بھی گیا گزرا تھا ۔

'' کیا بھاؤ ہے؟ ؟ عورت نے پُوچھا اور پھر رُک سیک دیکھ کر کہنے لگی ۔ '' چاہو تو اندر

آ کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میں دیکھتی ہوں میرے پاس کتنے پیسے بچے ہیں۔ شاید اتنے ہوں کہ تھوڑی سی چائے خرید لوں۔''

ریو اندر چلی گئی اور اپنا رک سیک اُتار کر رکھ دیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں تیل کے چولہے کے گرد قمیضوں اور جرابوں کے ایک انبار میں سلائی کرنے والی چار عورتیں بیٹھی تھیں۔ یہ میرے ہی جیسی عورتیں ہیں۔ ریو نے سوچا اور سوئیوں کو کپڑے کے اندر اور باہر آتے جاتے دیکھتی رہی۔ ایک جدت آفرین احساس اس پر چھا گیا۔

ٹائی گانگ
(ملائشیا)

سیلز گرل

پرلز ہل کے آس پاس تمام گلیاں صبح کی روشنی میں بیدار ہو چکی تھیں۔تقریباً سات بج رہے تھے۔ بُرج کے گھڑیال نے موسیقی کی دُھن بجائی۔ ہمسائے میں رہنے والی لڑکی اس دنیا کے جی خوش کرنے والے مقامات میں سے ایک میں کیبرے رقاصہ تھی اور اپنے تیسرے گاہک کے ساتھ ابھی بستر میں تھی۔لکڑی کے دیوار کے پیچھے سے نرم اور جنسی قسم کے قہقے کبھی کبھی سنائی دیتے۔سامنے والے کمرے میں مادام کوئی کا خاوند رہتا تھا جو اپنے سبزی کے ڈھیر کے ساتھ کب کا بازار جا چکا تھا۔البتہ مسٹر وانگ اپنے کمرے میں تھا کیوں کہ پچھلی شب اُس پر کھانسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ بلغم کے ساتھ خون تھوکتا رہا تھا۔شاید وہ آج بھی کام پر نہ جا سکے۔وہ پھلوں کی دکان پر نائب خزانچی تھا اور صرف سولہ ڈالر ماہانہ تنخواہ پر کام کرتا تھا۔

لکڑی کی دیواروں کے کمرے کے باہر راہداری میں مشترکہ باورچی خانہ تھا۔وہاں صرف دو سٹو جل رہے تھے۔رقاصہ کی ماں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کچھ سوچ رہی تھی۔اپنے خیالوں میں بالکل گم تھی۔اُس کے قدموں میں ایک بلی لیٹی تھی جو اپنی دُم چاٹ رہی تھی۔اُسے گاہک کے کمرے سے نکال دیا تھا۔

گیزو ابھی اٹھی نہیں تھی۔اُس کی ماں نے دلیے کا ناشتہ تیار کیا تھا اور بہت آہستگی سے کمرے سے آئی تھی تاکہ ہمسایوں کو تکلیف نہ ہو۔اُس نے اپنی بیٹی کو سرگوشی میں کہا: ''گیزو، سات بج چکے ہیں۔اٹھو گی نہیں؟''

لڑکی نے جواب دینے سے انکار کر دیا لیکن صاف ظاہر ہے وہ جاگ رہی تھی۔پچھلی

شب وہ روتی رہی تھی اور اتنی دیر تک اور پُر شور انداز میں احتجاج کرتی رہی تھی کہ برابر کے کمرے کا گاہک درمیانی دیوار پر دستک دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ فارمیسی میں سیلز گرل کی حیثیت سے کام نہیں کر سکے گی کیونکہ مینجر نے اصرار کیا تھا کہ وہ عام دوائیوں کے ساتھ جنسی دوائیاں مثلاً ''پیار کی دوائی'' اور ''چھوٹا عشق'' وغیرہ بھی فروخت کرے اور یہ ایک کنواری اور سولہ برس سے بھی کم عمر لڑکی کے لیے انتہائی معیوب بات تھی۔ وہ تو یہ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری لڑکیاں جو ذرا ڈھیٹ تھیں وہ کر سکتی تھیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو ''چھوٹا عشق'' خریدنے کی ترغیب دے سکتی تھیں لیکن اس نے پہلے دن سے نہ تو اِن دوائیوں کا نام لیا تھا اور نہ اُنھیں فروخت کیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک مینجر کو انکار نہیں کر سکتی چنانچہ اجنبیوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بہتر تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے۔ اور اسی لیے گھر پہنچتے ہی رونے لگی تھی اور اُس نے قسم کھا کر اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ اُس کی کزن کو کہے کہ مینجر سے بات کر کے اُسے بتا دے کہ وہ نوکر چھوڑ رہی ہے۔ لیکن اُس کی ماں تو یہ سب کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ اور اب وُہ بستر سے اُٹھنے کو تیار نہ تھی۔

''گیزو۔ گیزو۔'' ماں نے بیٹی کو جھوٹ موٹ سوتے دیکھا تو بہت بے چین ہوئی۔ ''اٹھو آٹھ بجنے لگے ہیں۔ تمھیں آٹھ بجے کام پر پہنچ جانا چاہیے۔''

دراصل پرلز ہل کے سامنے سے گزرنے والی ٹرام کی آواز اُن کی کھڑکی سے سنائی دے جاتی تھی۔ ''اٹھو۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔ تمھیں بہر صورت کام پر جانا ہے۔''

ماں نے اپنی بیٹی کو دھکیل کر اُٹھانے کی کوشش کی۔

لیکن گیزو نے منہ موڑ لیا اور بلا جھجک کہنے لگی: ''تم چاہتی ہو کہ میں وُہ شرمناک چیزیں فروخت کروں۔ میں تو نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟'' ماں نے بیٹی کے کان میں سرگوشی کی۔ ''بیوقوف مت بنو گیزو۔ امائے سے آنے کے بعد ہم اپنی ساری جمع پونجی ختم کر چکے ہیں۔ تم یہ تو جانتی ہو۔

تم اپنی ماں کی مدد کیوں نہیں کرتیں؟''

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''ذرا دوبارہ کہنا۔'' ماں ناراض دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے باوجود اُس کی آواز میں نرمی تھی۔ ''تم یہ کیوں کہتی ہو کہ اُن چیزوں کو بیچنا شرمناک ہے۔ ساتھ والے گھر

میں ۔ ۔ ۔ ‘‘اس نے اپنی آواز اور آہستہ کی، ’’شرمناک تو وہ ہے جو یہ ساتھ والی کر رہی ہے ۔ لی کی دوسری بیٹی ۔ ابھی اسے رقص سیکھے صرف ایک مہینہ ہوا ہے اور یہ تیسرا گاہک ہے جس کے ساتھ وہ بستر میں گئی ہے ۔ اُن کی مالی حالت اگر چہ پہلے سے بہتر ہو گئی ہے لیکن پھر بھی شرم کی بات تو ہے ۔ تمھاری کمپنی تمھیں آٹھ ڈالر ماہانہ تنخواہ دیتی ہے اور اگر تمھارا کام تسلی بخش ہوا تو پانچ فیصد بونس بھی ملے گا ۔ یہ کوئی بُری نوکری تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ گیز و ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی ماں کی بات سُنو ۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ اور غسل کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارا دلیہ ابھی تیار ہو جائے گا ۔‘‘

ماں نے بیٹی کو بستر سے گھسیٹ کر نکالا، اُسے کچھ کپڑے دیے اور گھر کے پچھواڑے میں واقع غسل خانے میں دھکیل دیا ۔ پھر وہ باورچی خانے میں واپس آئی تا کہ دلیہ اپنے کمرے میں لے جا سکے اور اس دوران رقاصہ کی ماں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے جو اب باورچی خانے میں اُونگھ رہی تھی کیوں کہ وہ کمرے میں اپنی جگہ اپنی بیٹی اور اُس کے گاہک کو دے آئی تھی ۔

سیلز گرل نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر جانے کے لیے کپڑے بدل کر میز پر بیٹھی اور اپنا دلیہ کھانے لگی ۔ ماں مسٹر وانگ کی کھانسی کی آواز سن کر فکرمند تھی لیکن اُس نے بیٹی کو زور دے کر کہا: ’’جلدی کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساڑھے سات بج گئے ہیں ۔‘‘

بیٹی نے آنکھیں نیچی کر لیں ۔ وہ اڑیل ہو گئی تھی ۔ ’’میں نہیں جاؤں گی ۔

میں بالکل نہیں جاؤں گی ۔‘‘ ’’اوہو، پھر وہی رٹ ۔‘‘ ماں نے اپنی چاپ سٹکس نیچے رکھ دی ۔ وہ غصے میں دکھائی دیتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی پُرسکون بھی تھی ’’میں نے تمھیں ہر شے کے بارے میں بتا دیا ہے ۔ تم اتنی ضدی کیوں ہو گئی ہو؟ ذرا سامنے والے کمرے میں رہنے والوں کو دیکھو ۔ چچا کی دِن بھر اپنی سبزیوں کا بوجھ ڈھوتا رہتا ہے اور اُسے صرف دس ڈالر ماہانہ ملتے ہیں ۔ اور تمھیں تو روزانہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے ۔ دوائیوں کا بکس اُٹھایا اور گلیوں میں بس گھومتے رہے اور مہینے کے آٹھ ڈالر کما لیے اور ان کے ساتھ بونس اور الاؤنس وغیرہ بھی ملتے ہیں ۔ کیا تم چچا کی سے بہت بہتر نہیں ہو؟ اور تو اور مسٹر وانگ، جو نائب خزانچی ہے، مہینے کے صرف دس ڈالر کماتا ہے اور اب وہ بیمار ہے اور اِسے بلغم کے ساتھ خُون آ رہا ہے ۔ اگر تم ہر ماہ صرف دس ڈالر کی مدد کر دیا کرو تو میں پریشانی سے بچ جاؤں گی تم ایک اچھی لڑکی ہو ۔ تمھیں مجھے اذیت تو نہیں دینا چاہیے ۔ پہلے ہی میں کون سا کم فکرمند ہوں ۔‘‘

ماں نے سبزیوں کی ڈِش بیٹی کے آگے کی لیکن اس کے ساتھ ہی اُس نے بڑی اشتیاق

سے اُن آوازوں کو بھی سنا جو ساتھ والے کمرے میں سے آ رہی تھیں۔ جوڑے کی آوازیں جلدی بند ہو گئیں اور مسٹر وانگ کی کھانسی اور مسز وانگ کا رونا دھونا سنائی دینے لگا۔

بیٹی نے دلیہ ختم کیا اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ماں نے بے شمار شکایتوں کو اپنے گلے میں اٹکا ہوا محسوس کیا لیکن اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اِس کے بجائے وہ پھر اپنی بیٹی کو مائل کرنے لگی: ''جاؤ گیزو۔۔۔۔۔ضرور جاؤ۔''

بیٹی دوبارہ چیخنے پر قابو نہ پا سکی۔ ''میں وہ چیزیں فروخت نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ شرم۔۔۔۔شرم۔۔۔۔۔شرم میں نہیں کروں گی۔نہیں کروں گی۔''

ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ سوائے اپنی بیٹی کو گھورنے کے اور کیا کر سکتی تھی؟

بڑا گھڑیال پھر موسیقی کی ایک دُھن بجانے لگا۔

''گیزو۔۔۔۔۔جلدی کرو۔'' ماں کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

''پونے آٹھ ہو گئے ہیں۔ پورے پونے آٹھ۔'' وہ اپنی بیٹی کو کچھ اور کہنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اُس نے اُس کے آنسو پونچھے اور سیڑھیوں کی طرح دھکیل دیا۔ بیٹی جھجکتی رہی۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی اور اس کا سراپا پیچھے سے انتہائی مایوس دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ سیڑھیاں اُتر گئی تو اُس نے ماں کی طرف دیکھا اور اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ وہ بیک وقت احتجاج بھی کر رہی تھی اور درخواست بھی۔۔۔۔اپنی ماں سے بھی اور فارمیسی کے مینجر سے بھی۔

لیکن احتجاج اور درخواست کے محسوسات کی جگہ شرمندگی اور پریشانی نے لے لی۔

سورج کی روشنی میں گلیاں ابھی خاموش تھیں۔ دھوپ جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہی تھی کہ وہ ابھی دوائیوں کا ایک بکس ہاتھ میں لے کر نکلے گی اور ان میں ''چھوٹا عشق'' بھی ہو گی۔ گلیوں بازاروں میں بیچنے کے لیے۔ وہ فارمیسی جانے کے لیے تیار نہ تھی لیکن کسی بے نام قوت کے زیرِ اثر وہ بالآخر وہاں پہنچ گئی۔

فارمیسی میں سوائے ایک اونگھتے ہوئے دُبلے پتلے بندر ایسے شخص کے اور کوئی نہ تھا اور وُہ کلرک تھا۔ مینجر اور دوسری لڑکیاں ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ اُس نے اپنی ڈیوٹی شیٹ پر دستخط کیے اور بندر ایسے کلرک نے اُسے ایک چھوٹا سا بکس تھما دیا۔ وہ جانے کو تھی کہ کلرک نے دانگ لچکچا کر کہا: میں گوئی، ''چھوٹے عاشق'' کو زیادہ بیچنے کی کوشش کرنا۔ تمہیں اپنے گاہکوں کو بتانا چاہیے

کہ یہ حد ذود اثر، انتہائی زبردست اور بڑے کام کی چیز ہے۔ جب وہ چیز تیار نہ ہو تو انھیں بس یہ کرنا ہے کہ تھوڑا سا ''چھوٹا عاشق'' اس پر ملنا ہے۔ باقی کام یہ خود کرے گا۔ پھر وہ جو جی چاہے کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو ایک لڑکا پیدا کر لیں۔ یہ سب یاد رہے گا ناں''

نفرت بھری آنکھوں کا بدنظر جوڑا اس پر آگ برسا رہا تھا۔

''ہاں میں جانتی ہوں۔'' گیز وا اپنے دل کی دھڑکن کو سن رہی تھی اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔شرم سے اُس کے کانوں کی لویں بھی تمتمانے لگی تھیں۔

وہ بکس کو زمین پر پھینک دینا چاہتی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی اور گالیاں دینا چاہتی تھی لیکن اُس نے کچھ بھی نہیں کیا۔اس کی بجائے وہ بندر کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے باہر نکل گئی۔

لیکن بندر کی آواز نے اُس کا پیچھا کیا: ''جو کچھ میں نے بتایا ہے اسے یاد رکھنا۔ دوائی فروخت کرنا بھولنا نہیں۔۔۔۔چھوٹا عاشق۔''

وہ جان بوجھ کر اس کا مذاق اُڑانا چاہتا تھا۔ وہ جواب دیے بغیر جلدی سے چلی گئی۔

جلتے سورج کے نیچے گیز وا ہجوم میں اپنا راستہ بناتی رہی۔ اُس کے لیے سنگا پور اجنبی اور جلتی ہوئی گلیوں کا ایک مجموعہ تھا۔ انسان اور کاریں بھون دینے والی دھوپ میں چرغائے جا رہے تھے۔ باہر سے دیکھا جائے تو وہ جانوروں کا ایک ریوڑ لگتے تھے جن کی شکلیں مسخ ہو چکی تھیں۔ اُنھیں راہ جاتے دوائیاں بیچنے والوں سے نفرت تھی۔

جونہی آپ اُن کے پاس جائیں وہ آپ کو ناقابل برداشت توہین آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یوں بھی گیز وصرف چھ ماہ قبل چین سے آئی تھی۔ وُہ اپنی ماں کے ہمراہ بہت کم باہر نکلتی تھی۔ وُہ ان لوگوں سے واقف تھی اور نہ ہی ان کے چال چلن سے۔ وُہ اس بات پر برہم تھی کہ آج بھی کل کی طرح ناکام رہے گی۔ جب اُسے بندر شکل کلرک کا خیال آیا تو اُس کی آنکھیں اُس کی شرماہٹ کی تمازت محسوس کرتی دکھائی دیں۔

اگر امائے پر جاپانیوں کا قبضہ نہ ہوتا تو ماں کبھی اُس کے ہمراہ سنگا پور نہ آتی اور نہ ہی اُسے اِن شرمناک چیزوں کو فروخت کر کے گزارہ کرنا پڑتا۔ وہ گھر کب لوٹیں گے؟ اِس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ تقریباً اپنا کام بھی بُھول گئی۔ اُسے یقین تھا اُس کا وطن وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا اور اُسے اپنے بہن بھائیوں کے چہرے اچھی طرح یاد تھے۔ جونہی وُہ کافی شاپ کے سامنے پہنچی وہ سب کے سب فوراً غائب ہو گئے۔

اُسے معلوم تھا عام طور پر اس جگہ حالات کاروبار کے لئے سازگار ہوتے ہیں۔ وہ کافی شاپ میں اِدھراُدھر گھومتی رہی اور اپنے آپ کو کہتی رہی کہ ان کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اوولٹین کا ایک ڈبہ پکڑے وُہ ایک آدمی کے پاس گئی۔ ''اوولٹین سَر؟'' اُس نے کہا۔ اُس آدمی نے اُس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلا دیا۔

''اوولٹین؟ گرائپ واٹر سَر؟''

اُس نے کسی اور کو مخاطب کیا لیکن نہ تو اُن شرمناک چیزوں کا حوالہ دیا اور نہ وہ کُچھ کیا جو دوسری لڑکیاں کرتی تھیں۔ وُہ بکس کھول کر اور نمونے باہر نکال کر گاہکوں کو متاثر کرتی تھیں۔ اُس کا خیال تھا اُن لڑکیوں کے برعکس وُہ ایک اچھی لڑکی ہے جو اُن جیسی حرکتیں نہیں کر رہی۔ لیکن ایک گاہک نے بھی اُس کی طرف دھیان نہ دیا۔ اُس کے دل میں ایک سیاہ دھبہ اور سرد دھبہ تھا جو لگتا تھا بڑھتا ہی بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جونہی وہ کافی شاپ سے باہر آئی تپتی ہوئی گلی نے اُس کا استقبال کیا۔ بہت جلد وہ ایک سبزی والے کی دوکان کے سامنے تھی۔ پھر دھات کی اشیاء کی دوکان کے قریب، اور پھر ایک چینی خاندان کے دروازے پر۔ لیکن ہر جگہ اُس کا استقبال سر کے منفی اشارے سے ہوا جس سے اُس کے دل کا سیاہ دھبہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ کوئی بھی ایسا نہ دکھائی دیا جو اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کا روادار ہوتا۔

اب اُس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کام کے اوقات کے خاتمے کا انتظار کرے اور پھر دوائیاں بنانے والی دوکان کی طرف لوٹ جائے۔ اُنھیں وہ بکس تھمائے اور پھر گھر جا کر چلاتے اور منّتیں کرتے ہوئے اپنی ماں سے پھر کہے کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اِس کام سے نجات دلوا دے۔ پہلے وہ دوپہر اور پھر شام کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن دوپہر سے پہلے ہی اس کی کزن سُوئے اُسے ایک پُر ہجوم گلی کے کونے میں مل گئی۔ سُوئے ہی نے اُسے فارمیسی والوں سے ملوایا تھا۔

''میں کافی دیر سے تمہارا پیچھا کر رہی ہوں۔'' سوئے شروع ہوگئی۔ ''اِس طرح تو چیزیں کبھی فروخت نہ ہوں گی۔ کبھی نہیں۔'' اُس کی کزن نے اُسے ڈانٹ پلائی، جس طرح سکول میں بڑی کلاس کی لڑکی رعب ڈالتی ہے۔ ''تم اپنا بکس کھول کر انھیں چیزیں کیوں نہیں دکھاتی ہو؟ ہوسکتا ہے اس کے اندر کوئی ایسی شے ہو جسے وہ خریدنا چاہیں اور اس سے تمھیں کچھ نفع ہو جائے۔ تم اُنھیں بکس کیوں نہیں دکھاتی ہو؟''

''میں ۔۔۔۔'' اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے لیکن ایک گرم شرماہٹ نے اُس کی کمر میں پنجے گاڑ دیے۔''تمھیں میٹھی میٹھی باتیں کرنا چاہییں۔ ذرا جان دار بنو تب تم بیچنے کے قابل بنو گی اور تبھی یہ آس بندھے گی کہ تم کچھ بونس بھی کما لوگی۔ ہوسکتا ہے کہ تم ماہانہ چھ سات ڈالر بطور بونس بنا لو۔ اس میں کیا خرابی ہے؟''

''یقیناً اس میں کوئی حرج نہیں۔'' اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ اس میں اپنی کزن کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس طرح چلتے ہوئے وہ سامنے آنے والے ایک شخص سے تقریباً ٹکرا ہی گئی۔ سوئے دوسری طرف جانے کے لیے مڑ گئی۔ گیز و تیزی سے آگے بڑھ کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے مڑی۔ اپنا بکس اس نے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ اپنی کزن سے بیک وقت ڈرتی بھی تھی اور اسے ناپسند بھی کرتی تھی اگرچہ سوئے نے اُس کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ سوئے نے شادی نہیں کی تھی لیکن جب کبھی ''چھوٹا عاشق'' بیچنے کی نوبت آتی تو وُہ اجنبیوں کو اس کے تفصیلی فوائد اور استعمال کے طریقے بتانے سے بالکل نہ ہچکچاتی۔ وہ ہر مہینے تین چار ڈالر بطور بونس بھی کما لیتی تھی اور گیز و کو اکساتی تھی کہ اس سے سبق سیکھے۔ لیکن وہ کیسے ان شرمناک چیزوں کو فروخت کرسکتی تھی اور بے شرمی کی راہ اختیار کرسکتی تھی۔

''میں اسے کبھی فروخت نہیں کروں گی۔''

اپنی کزن کے دور ہوتے سراپے کی طرف دیکھتے ہوئے یہ احتجاج اُس کے دل کی گہرائیوں میں سے نکلا۔ اس دوران میں وُہ ایک کار کے نیچے آتے آتے بچی۔

اب وہ بد دل ہو کر پسینے سے شرابور ہوگئی۔ وہ پیچھے ہٹ کر فٹ پاتھ پر آرام کرنے کو تھی کہ پھر سب کچھ بھلا کر دوکانوں اور گھروں میں دوائیاں فروخت کرنے کے لیے چل دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے اپنی کزن کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اپنی عام تقریر کے علاوہ اُس نے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے آپ کو یہ کہتے سنا: ''جناب کیا آپ بچوں کی خوراک خریدنا پسند کریں گے؟ ہمارے ہمسائے کا ایک بچہ ہے جسے یہی خوراک دی جاتی ہے اور وُہ بچہ خوب صحت منداور موٹا تازہ ہے۔''

اسے نہ تو اس نئی تقریر سے فطری مناسبت تھی اور نہ ہی وہ روانی سے بول سکتی تھی اور نہ ہی وہ ابھی ''ننھے عاشق'' کا کوئی حوالہ دینا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے ناموجود ہمسائے کا حوالہ دیے چلی جا رہی تھی۔ جب وُہ دوکان سے باہر آئی تو بے اختیار ہنسنے لگی کیوں کہ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ

وُہ اتنی آسانی سے جھوٹ بول سکتی ہے۔ اُس کا اصلی ہمسایہ اس قابل نفرت طوائف اور اُس کے گاہکوں کے علاوہ اور کون تھا؟

تاہم اُس کے دل کے سیاہ دھبے نے بڑھنا نہیں چھوڑا تھا کیوں کہ ہر کوئی انکار میں سر ہلائے جاتا تھا۔ وُہ گھنٹے بھر تک ایک سے دوسری دوکان میں جاتی رہی۔

''یہ ایک بہت ہی مشہور۔۔۔۔۔۔'' گھڑیاں بیچنے والی دوکان میں وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ یہ ہے۔۔۔۔''

''کیا۔۔۔۔ بہت ہی مشہور؟۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔۔۔ننھا عاشق؟'' یہ ایک چائے خانے کا مالک تھا، ایک موٹا آدمی جو پتلون پہنے ہوئے تھا لیکن اُس کی چھاتی کھلی تھی۔ لڑکی کو ایک دم ہوش آ گیا۔ وہ کانوں سے آنکھوں تک سرخ ہوگئی یہاں تک کہ وہ اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کرسکی۔ وہ اپنے کلرک کے ساتھ کاٹ دار فقروں کا تبادلہ کررہا تھا اور وہ دونوں اُس کی طرف میلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ بری طرح بدحواس ہوکر موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''اوولٹین۔۔۔۔گرائپ واٹر۔۔۔۔۔مالک''۔

''مجھے اوولٹین نہیں ننھا عاشق چاہیے۔''

مالک نے جی کھول کر قہقہہ لگایا۔ شاید وہ سچ مچ اسے خریدنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے دل کی دھڑکن محسوس کی اور اُس کے جسم میں ایک گرم لہر دوڑ گئی۔ یک دم اُس نے اپنے آپ کو کہتے سُنا: ''ہاں ہاں، یہ میرے پاس ہے''۔

ایک بیٹھی ہوئی آواز جس پر اسے فوراً ندامت محسوس ہوئی۔ اُس نے اسے یہ کیوں بتایا کہ وہ اس کے پاس ہے؟ اسے جواب ہی کیوں دیا؟

بہرحال اُس نے بکس کھول کر اُس شرمناک چیز کی بوتل نکالی۔ شرماتے ہوئے اُس نے وہ بوتل تو ندیل گاہک کو تھما دی۔ اُس کا دل پہلے سے زیادہ زور سے دھڑکنے لگا اور اس نے اتنی کمزوری محسوس کی کہ اُسے پتا نہ چلا کہ وہ کیا کررہی ہے یا کیسے واضح گفتگو کرسکتی ہے۔ اُس نے یہ کہا ہی کیوں کہ وہ اُس کے پاس ہے۔۔کیوں؟''

''اسے کیسے استعمال کرتے ہیں؟''

گاہک نے یُوں پُوچھا جیسے وہ سچ مچ اس کے استعمال سے واقف نہیں۔ وہ ہاتھ میں

پکڑی بوتل کے ساتھ ایک کھلونے کی طرح کھیل رہا تھا۔ اپنے کان کے پاس لے جا کر وہ اسے ہلاتا تاکہ دوائی کی آواز سُن سکے۔ اِس کھیل نے تو اُسے اور بدحواس کر دیا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اُس ہاتھ کا کیا کرے جس سے اُس نے بکس پکڑا ہوا تھا۔ بالآخر اُس نے سر اُٹھا کر موٹے شخص کی طرف دیکھا جواب بھی اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔''جناب آپ تو بہر حال۔۔۔۔۔''اُس نے اپنے آپ کو کہتے سُنا،''آپ تو یقیناً اِسے استعمال کرنا جانتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں نا!'' یہ سب کچھ اُس کے اندر سے اُبل پڑا۔ وہ جو بھی کہہ سکتی تھی اس نے کہہ دیا اور اس کے سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی۔

''۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔میں تو نہیں جانتا''۔

وُہ شخص بوتل کے ساتھ کھیلتا رہا پھر یک دم لڑکی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:''تم اندر آجاؤ۔ میں کچھ اور چیزیں بھی دیکھنا چاہتا ہوں''۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوکان کے عقب میں واقع کمرے میں چلی گئی۔

''اچھا تو اب مجھے بتاؤ کہ اِسے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے''۔موٹے شخص نے آواز دھیمی کر کے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔اُس نے کسی اور شے کو دیکھنے کے لیے بالکل نہیں کہا۔''کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟ اسے کیسے لگایا جاتا ہے؟''

''میں ۔۔۔۔۔میں''۔

جیسے کسی شے نے اُسے دکھ دیا ہو۔اس کا دل منہ کے راستے باہر آنے کو تھا۔وُہ بوکھلا گئی تھی۔اس نے بوتل کو جھپٹا مارا اور بکس میں رکھ کر آناً فاناً دروازے سے باہر نکل گئی۔

''لعنت ہے تم پر۔۔۔۔لفنگے۔۔۔۔درندے''۔

وُہ گالیاں دیتے ہوئے چلا رہی تھی اور کمرے میں ایک فلک شگاف قہقہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

وُہ غصے سے اُبلتی ہوئی گلیوں میں آ گئی اور اور ہجوم میں راستہ بنانے لگی۔ وہ اپنی ماں کو یا فارمیسی کے مینجر کو قصوروار ٹھہرانا بھول گئی کہ اُنھوں نے اس شرمناک چیز کو بیچنے کے لیے زور دیا تھا۔صرف پیسہ بنانے کے لیے۔ یا اُس کی وُہ کزن جس نے اسے اس ملازمت کے حصول میں مدد دی تھی۔وُہ پاؤں پٹختی ہوئی چلتی رہی اور کسی کافی شاپ یا کسی اور دوکان کے اندر نہ گئی۔ اُسے ایک ناقابلِ بیان دُکھ ہوا، لیکن صرف دُکھ۔ایک ایسی شے کے بارے میں دُکھ جو وُہ بیان

نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر وُہ فارمیسی کے سامنے کھڑی تھی اور اسے اپنی کزن کی آواز کہیں سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ وُہ فارمیسی کے اندر چلی گئی۔ اُس لمحے اُسے یوں لگا جیسے اُس نے موٹے شخص کا سایہ دیکھا ہے اور وہ ننگا تھا۔ وہ فارمیسی سے باہر آ گئی۔ اُس کی کزن نے اُسے پکارا۔ وُہ اُس کا پیچھا کر رہی تھی۔ گیز و نے گلی پار کی اور اس غریب مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگی جس کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں وُہ رہائش پذیر تھی۔ جونہی وُہ کمرے میں داخل ہوئی اُس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا اور روتے ہوئے کہنے لگی:

''میں کام پر بالکل نہیں جاؤں گی۔ میں اب کام پر نہیں جاؤں گی''۔

''ہوا کیا ہے؟ مسئلہ کیا ہے؟'' اُس کی کزن نے بستر پر جھک کر اُس سے بکس لے لیا اور ایک طرف پھینک کر اُسے جھنجھوڑا اور جواب دینے کے لیے کہا۔ ماں وانگ کے کمرے میں تھی، وہ بھی جلدی سے باہر آ گئی تھی۔ اپنی بیٹی کو یوں روتے دیکھ کر اُس کا دل بہت دُکھا۔

''گیز و۔ کیا ہوا؟ گیز وُ''۔

''تم بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہو۔ سیلز گرل کو کبھی کبھی تکلیف تو ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھار گالیاں بھی سننا پڑتی ہیں ورنہ یوں تو پھر ہر کوئی سیلز گرل بن جائے''۔ کزن نے گیز و کو جھنجوڑا، ''رومت۔ میرے سامنے آؤ۔ میں دیکھتی ہوں اس نے تمھاری بے عزتی کی ہے''۔

''میں اس قسم کا کام نہیں چاہتی۔ میں یہ کام نہیں کروں گی''۔

وُہ دکھ اور بے چارگی سے روتی رہی۔ اُسے اب بھی وُہ موٹا آدمی قہقہے لگاتا دکھائی دیتا تھا۔ ساتھ والا جوڑا بیدار ہو چکا تھا۔ جب کبھی گیز و رک کے چلانے کی آواز مدھم ہوتی اُن کے جنسی قہقوں کی آواز ابھر آتی۔ لیکن جلد ہی قہقہوں کی جگہ سسکیوں اور آہوں نے لے لی۔

چچی کی اور مسز وانگ بھی اپنے کمروں میں رو رہی تھیں کیوں کہ مسٹر کی کو پولیس نے ٹریفک میں خلل ڈالنے کے الزام میں پکڑ لیا تھا کیوں کہ اُس نے اپنا سامان بیچ بازار میں رکھ دیا تھا اور مسٹر وانگ نے پھر خُون تھوکا تھا اور اُس کے مالک نے اسے ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف ٹیکسی گرل کی ماں کو کوئی فکر و فاقہ نہ تھا۔ وُہ راہداریوں میں پھر رہی تھی۔

''یہ مت کہو کہ تم کام نہیں کرو گی۔ مت کہو کہ تم کام نہیں کرنا چاہتیں''۔ ماں نے کہا۔ ساتھ والے کمرے میں گاہک گنگنا رہا تھا۔ پھر ماں نے روتے ہوئے سرگوشی کی، ''کیا روزی کمانا

آسان ہے؟ اگر تم مشکلات برداشت کرنے کی عادت نہیں ڈالو گی تو پھر کیا ہو گا!''

''ہوا کیا ہے؟ قصہ کیا ہے؟'' سُوئے نے پُوچھا۔

گیزوا اپنی کزن کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس دوران برابر کے کمرے سے ہنسی کی آواز آنے لگی جیسے کوئی کسی کو چھیڑنے پر تُلا ہوا ہو۔

چاہے تمھیں ناگوار لگے پھر بھی تمھیں کام پر جانا پڑے گا۔ ذرا مسٹر وانگ کو دیکھو۔ وہ مہینے بھر سے کام پر نہیں گیا چنانچہ کیا ہوا؟ اگر تم غریب ہو تو پھر کیا کہا جا سکتا ہے؟ اگر تم کام نہیں کرو گی تو کھاؤ گی کہاں سے،''

ماں نے اس کے آنسو پونچھے اور کُرسی میں ڈھیر ہو گئی۔ مسز وانگ اور چچی کی سسکیوں کی آواز سنتے اور اپنی بیٹی کے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے مایوسی اس پر غالب آتی جا رہی تھی۔

''میرے ساتھ آؤ گیزو۔ ساڑھے دس بج چکے ہیں۔'' سُوئے نے کہا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔''

''نہیں۔۔۔۔تم نہیں جاؤ گی''۔ اُس کی ماں نے دہرایا۔

''بہر حال مجھے تو جانا ہے''۔ کزن نے کہا اور اُن دونوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔

سیڑھیاں اُترتے قدموں کی آواز دبی دبی ہنسی۔ دوسرے کمروں سے آہ وزاری کی آوازیں۔

''تم نہیں جاؤ گی۔۔۔۔۔نہیں جاؤ گی۔۔۔۔۔۔تو تم چاہتی ہو کہ ہم بھوکے مر جائیں؟''

ماں سسکیاں بھر رہی تھی۔

برابر کے کمرے سے آنے والا قہقہہ پھر سنائی دیا لیکن اس دفعہ وہ بالکل بناوٹی تھا۔

چو چونگ ہی
(کوریا)

چوم نائے

رات ہے۔ گاؤں اور بالائی گاؤں کے تمام لوگ ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جمع ہیں۔ چاند بھی نہیں ہے۔ جھاڑیاں، پھولوں کی بیلیں، مکی کے ٹانڈے اداس ہیں۔ ایک پُرخوف تاریکی ہے جو پانی سے بھرے دھان کے کھیتوں میں منعکس ہوتے تاروں کی وجہ سے کچھ کم ہوتی ہے۔ اور دھان کے کھیتوں کے پانی دروازے کے باہر ایک سمندر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن اِن میں سے ایک بھی اس گھر سے تعلق نہیں رکھتا۔

گھر کے صرف تین حصے ہیں۔ ایک آدھا باورچی خانہ، ایک چھوٹا برآمدہ اور ایک کمرہ۔ اِس وقت صحن اور کمرہ لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں اتنے زیادہ لوگ جمع ہیں کہ وُہ حرکت نہیں کر سکتے۔ کچھ مرد سیر کرتے ہوئے اِدھر اُدھر نکل گئے ہیں اور کچھ دھان کے کھیتوں کے کناروں پر جا بیٹھے ہیں۔ لیکن عورتیں آگے بڑھنا چاہتی ہیں۔ جنھوں نے اپنے بچے پیٹھ پر اُٹھا رکھے ہیں وُہ اُن کی حفاظت کے لیے شور مچا رہی ہیں لیکن وُہ پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ ہوا اُن کے کپڑوں کی بدبُو اور گندے جسموں سے بھاری ہو رہی ہے۔

وہاں ایک بھی ملاقاتی نہ تھا، ایک کُتا تک بھی نہیں، جب پچھلی رات چوم نائے فوت ہوئی بلکہ آج صبح تک بھی کوئی نہیں تھا جب اُس کا باپ اور منگیتر یوگی اُس کا مُردہ جسم اٹھا کر لے گئے لیکن آج رات وہ یہاں جمع ہیں تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ شامانی جادو کی رسموں کے ساتھ اُس کی رُوح کو کیسے آزاد کیا جاتا ہے۔ وہ کتنے پتھر دل تھے! اُن کا خیال تھا چوم نائے کی موت غیر قدرتی

ہے اس لیے وہ اندھے جوتشی کے ہاں سے اپنی حفاظت کے لیے تعویذ لے کر آئے تھے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص مُردہ لڑکی کی رُوح کے قابو میں آ جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ تو پھر وُہ یہ رسم دیکھنے کے لیے کیوں آئے ہوئے تھے؟

افواہ تھی کہ چوم نائے اس لئے مرگئی تھی کہ ایک مرغی کی رُوح اُسے چمٹ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھیں معلوم ہوا کہ اُس کی موت کا تعلق ہوسنگ گُو خاندان سے بھی ہے۔ لوگ ان دو حقائق میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُنھیں چوم نائے سے زیادہ دلچسپی نہیں لیکن ہوسنگ گُو اِس گاؤں کا امیر ترین آدمیوں میں شمار ہوتا ہے اور اُسے سیول میں بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ اُس شام غریب لوگ اُس کے گھر میں جمع ہو رہے تھے تاکہ ایک امیر آدمی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ سکیں اور اُس کی تکریم کریں۔ کبھی کبھار وہ اُسے ایک دیوتا کے طور پر مانتے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر چوم نائے کسی عام بیماری سے مرتی تو لوگ اس طرح جمع نہ ہوتے۔ صرف اُس کے خاندان والے، اُس کا منگیتر اور چند ہمسائے ہی اُس کی آخری رسوم کے لیے آتے۔

جب چوم نائے مری تو لوگوں نے ایک دلھن یا ایک کنواری کی موت کے بارے میں چہ میگوئیاں کیں۔ لیکن نہ تو وُہ ایک دلھن تھی اور نہ ہی کنواری۔ وہ ایسی اصطلاحات پر پورا نہیں اُترتی تھی۔

اُس کے والدین نے شدید غربت کی وجہ سے صرف اس لیے، کہ اُن کا ایک بچہ اچھی طرح خوراک حاصل کر سکے، اُس کی منگنی یوگی کے ساتھ کر دی تھی جو منڈی میں ایک شراب فروش کے ہاں ملازم تھا۔ وہ صرف چودہ برس کی تھی۔ چونکہ اُس کی منگنی ہو چکی تھی اس لیے لوگ اُسے دلھن کہتے تھے۔ یوگی کو اس لیے نہیں چُنا گیا تھا کہ وہ بہت امیر تھا، اس لیے بھی نہیں کہ وہ خوش شکل تھا بلکہ صرف اس لیے کہ وہ شراب خانے میں باقاعدہ ملازم تھا۔ اگر وُہ اُس کے ساتھ بیاہی جائے تو باورچی خانے میں کام کر سکتی ہے اور وہاں اسے کھانا مل سکتا ہے کہ غریب لوگوں کے لیے کھانا بہت اہم ہوتا ہے۔

منگنی کے بعد ان کی شادی اس لیے نہ ہو سکی کہ دلھن کے پاس ایک مناسب لباس ہونا ضروری ہے لیکن اس کے کنبے کے پاس اس لباس کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس کنبے میں نو افراد تھے جن میں دادا، دادی، ماں باپ اور چار چھوٹے بچے شامل تھے۔ خوراک اُن کا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ لباس کے بارے میں سوچنے کے لیے اُن کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ منگیتر بھی خاندان

کی نسبت زیادہ خوشحال نہ تھا۔ اُس کی ماہانہ تنخواہ خوراک کے علاوہ صرف پانچ سوؤن تھی۔ پانچ سوؤن میں وُہ دلھن کے لیے ریان کا ایک سکرٹ اور ایک بلاؤز نہیں خرید سکتا تھا اس لیے اُنھوں نے پانچ ماہ کے لیے شادی کو ملتوی کر دیا تا کہ اس دوران منگیتر کُچھ رقم جمع کر لے۔

پانچ ماہ کے خاتمے پر یوگی اپنی منگیتر کے گھر گیا اور اُس کے پاس دو ہزار پانچ سوؤن تھے۔ چوم نائے کی ماں نے یوگی سے کہا کہ وہ سیول جا کر لباس کے لیے کپڑا خرید لائے اور وُہ خود فوراً جوتشی کے پاس شادی کی تاریخ نکلوانے چلی گئی۔قمری کیلنڈر کے چوتھے مہینے کی اٹھائیس تاریخ طے ہوگئی۔ یوگی نے سیول جا کر گلابی ریان اور سوتی کپڑا خریدا۔سفید کپڑا بلاؤز کے لیے، پاؤڈر کا ڈبہ اور اپنی دلھن کے لیے ایک آئینہ اگر چہ وُہ محض ایک کھلونا تھا۔اپنے لیے اُس نے مقامی جُوتوں کا ایک جوڑا خریدا جو پُرانے ٹائروں سے بنا ہوا تھا اور ایک جوڑا جرابیں۔اس خریداری میں اُس کی کل پونجی خرچ ہوگئی۔ جب وُہ دلھن کے گھر آیا تو ماں اور دادی نے آئینے کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ اُسے دلھن کی جرابوں کے لیے سُوتی کپڑا بھی خریدنا چاہیے تھا۔ یوگی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور سر ہلایا۔ بالآخر اُس نے اُنھیں بتایا کہ اُس کی خالہ نے اُسے دو چوزے شادی کے تحفے کے طور پر دینے کا وعدہ کیا ہے۔تب وُہ پہاڑی کے پار گیا، چوزے حاصل کیے اور اُنھیں چوم نائے کے گھر لے گیا۔ جب یہ بڑے ہو جائیں گے تو دلہن کی جرابوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا!

لیکن شادی کے منصوبوں میں ایک اور اڑچن آ پڑی۔ تاریخوں کا مسئلہ۔قمری سال کے چوتھے مہینے اٹھائیس تاریک کو 16 جون تھی جس دن سَن ہانگ کی شادی ہو رہی تھی جو ہوسنگ گُو کی بیٹی تھی۔ یہ تاریخ گزشتہ نومبر میں طے پائی تھی اور ہر کوئی جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے لیکن چوم نائے کے کنبے کو احساس نہ ہوا کہ دونوں تاریخیں ایک ہیں۔16 جون سے صرف دس روز پہلے، جب ہُو گھرانے والے اپنے رشتے داروں اور اپنے مزارعوں سے مل رہے تھے، صرف اُس وقت چوم نائے کے کنبے کو پتا چلا۔ دوسروں کے لیے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔لیکن چوم نائے کے کنبے کے لیے، جو پُشت ہا پُشت سے ہُو گھرانے کے مزارع چلے آ رہے تھے یہ ایک سنجیدہ مسئلہ تھا۔اُنھوں نے مسٹر ہو کو اپنی بیٹی کی منگنی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ہو خاندان یقیناً اُس چیز کو ناپسند کرتا کیونکہ چوم نائے اکثر اُن کا کام کیا کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ لڑکی کے والدین اس لیے بھی شرمندہ تھے کہ لڑکی کی عمر شادی کے لیے ابھی بہت چھوٹی تھی۔ چنانچہ چوم نائے کے گھر

والوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اعلان کر دیں کہ اُن کی بیٹی کی شادی اُسی تاریخ کو ہو رہی ہے جس تاریخ کو اُن کے زمیندار کی بیٹی کی شادی طے پائی ہے۔

مایوس ہو کر چوم نائے کی ماں جوتشی کے پاس گئی تا کہ اُسے پوری صورتِ حال بتا کر کوئی نئی تاریخ نکلوا سکے۔ ہو سکے تو اس سے بھی پہلے! لیکن نابینے جوتشی نے سر ہلا کر بتایا کہ ساتویں مہینے کی پندرھویں تاریخ سے پہلے کوئی تاریخ مناسب نہیں۔ اِس سے پہلے کی کوئی بھی تاریخ جوڑے کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوگی۔ اُن میں سے کسی ایک کی ٹانگ بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ساتویں مہینے کی پندرھویں تاریخ پر راضی ہو گئے۔

چوم نائے نے یہ خبر سُن کر سُکھ کا سانس لیا کہ شادی تین ماہ بعد ہوگی۔ یہ نہیں کہ وُہ شادی کروانے میں لیت ولعل کر رہی تھی بلکہ اُسے معلوم تھا کہ اتنے عرصے میں چوزے اتنے بڑے بڑے ہو جائیں گے کہ وہ اُنھیں فروخت کر کے جرابوں کی بجائے کوٹ کا کپڑا خرید سکے گی۔ اُسے اپنی سہیلی سُونی یاد تھی۔ شادی کے بعد وہ ایک نفیس کوٹ میں ملبوس تھی اور اُس کا چہرہ کریم سے گورا ہو رہا تھا۔ چوم نائے اُس کی نقل کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بہر حال اتنی احمق نہیں تھی کہ ہُو کی بیٹی کی فضول خرچیوں کی نقل اُتارے۔ اُس نے اُس امیر لڑکی کے ساتھ کبھی بھی اپنا مقابلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی اپنی غربت کا رونا رویا تھا۔ اُس کے ذہن میں غیر مساوی معاشرے کا کوئی تخیل نہ تھا اس لیے وُہ اس حقیقت کو قبول کرتی تھی کہ کچھ لوگ امیر ہوتے ہیں اور کچھ غریب۔ صرف چوم نائے ہی نہیں بلکہ اس طبقے کے بیشتر لوگ اس صورتِ حال کو قبول کرتے تھے اور اس قسم کی غلامانہ ذہنیت نے صرف ایک دو دن میں یا دس بیس برس میں جنم نہیں لیا تھا بلکہ پُشت ہا پشت کی غلامی نے اُن کو ایسا کر دیا تھا۔

ہُو کی کی بیٹی کی شادی بہت شاندار تھی اور ضیافت انتہائی پُر تکلف۔ بے شمار لوگ کھانے اور خاص طور پر پینے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ کچھ کا خیال تھا کہ کم از کم دس ہزار افراد شامل ہوئے تھے اور کئی تو ایک لاکھ کے قریب قریب بتاتے تھے۔ چونکہ ہُو کی صرف ایک ہی بیٹی تھی اس لیے اُس نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ مہمان صرف آس پاس کے گاؤں سے ہی نہیں بلکہ سیول تک سے آئے۔ اِن میں اعلیٰ حکام کے علاوہ امریکی معززین بھی شامل تھے۔

اِس شاندار تقریب کے کئی روز بعد ہُو کی بیٹی، داماد اور دیگر عزیز و اقارب سیول روانہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ وہ تحائف اور دولت تھی جو دُلھن ساتھ لے کر آئی تھی۔

تین دن بعد چوم نائے کا ایک چوزہ ہُو کے گھر ترکاریوں کی کھیتی میں چلا گیا اور اِسے مسٹر ہُو نے پکڑ لیا۔ ہُو جانوروں اور مزارعوں کے ساتھ بالعموم اچھا سلوک نہیں کیا کرتا تھا۔ وُہ چوزنے کے ساتھ باقاعدہ ظلم پر اُتر آیا۔ بیٹی کی شادی کے شور شرابے کے بعد وہ اب ذرا اُلجھا ہوا تھا یا شاید اُسے اتنی زیادہ دولت لُٹا دینے کا دُکھ ہو رہا تھا یا شاید اُسے اپنی اکلوتی بیٹی کے کسی اور کے پاس چلے جانے کا غم تھا، جواز جو بھی ہو وُہ بے حد غصے میں تھا۔ اُس نے چوزے کے پر باندھ کر اُسے ایک لمبے بانس کے سرے پر باندھ دیا اور بانس کو باڑ میں کھڑا کر دیا۔ عام طور پر وہ آوارہ مرغیوں کو پتھروں سے ہلاک کر دیا کرتا تھا یا اُن کی ٹانگیں توڑ دیا کرتا تھا۔ چونکہ ہُو کا گھر بہت بڑا تھا اور اُس کا باغ بہت چوڑا تھا اس لیے مزارعوں کے چھوٹے چھوٹے گھروں نے اُس کے گھر کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور ان کی مُرغیاں وغیرہ اکثر باڑ پر سے اُڑ کر اُس کے باغ میں جا کر خوراک تلاش کرتی رہتی تھیں۔ چنانچہ ہُو نے اپنے مزارعوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ مرغیاں نہ پالا کریں حالانکہ پورے ملک میں رواج تھا کہ مرغیاں کھیتوں اور باغوں میں آزادانہ آ جا سکتی ہیں۔ غریبوں نے اِس حکم کی بھی تعمیل کی۔ کُچھ مرغ مرغیاں کھائے گئے، کچھ فروخت ہوئے اور کچھ ہُو کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ چنانچہ پُورے گاؤں میں چوم نائے کے علاوہ کسی کی مُرغیاں باقی نہ رہیں۔ ظاہر ہے چوم نائے اور اُس کا خاندان مرغیوں کو آزادانہ نہیں گھومنے دیتا تھا۔ پہلے پہل اُنھوں نے اُن کو ایک رسی سے باندھے رکھا، پھر چار دیواری کے اندر بند رکھا لیکن اُس روز جب اُنھیں پانی ڈالنے کے لیے دروازہ کھولا گیا اُن میں سے ایک چوری چھپے باہر آ گئی اور کسی نہ کسی طرح ہو کے باغ میں پہنچ گئی۔

مُرغی آسمان میں اٹکی چیخ رہی تھی اور ہُو غصے میں بکتا جا رہا تھا: یہ کس کا چوزہ ہے؟ کیا یہ چوم نائے کے باپ تائے چون کا ہے؟ وہ مرغیاں پالتا ہے اور اُنھیں آزادانہ گھومنے دیتا ہے۔ لوگ تو بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ وُہ مجھ سے بھی بد تمیزی سے بولتے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں کہ وُہ کس کے کرم کی وجہ سے زندہ ہیں۔ پُشت ہا پُشت سے وُہ میرے خاندان کی دولت پر پلتے آئے ہیں۔ اب وہ مساوات کی بات کرتے ہیں۔ یہ تائے چون بھی ایسے ہی بدتمیزوں میں سے ایک ہے۔ مُرغیاں پالتا ہے اور میری سبزیاں خراب کرتا ہے۔ (اُسے ایک نوکرانی نے بتایا تھا کہ مرغی تائے چون کی ہے۔) چوم نائے اور اُس کا خاندان جانتا تھا کہ ہُو نے اُن کی مُرغی پکڑ لی ہے لیکن اُس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اُس کی واپسی کا

تقاضا کر سکتے۔ اُن کے پاس خوفزدہ ہونے کی ایک خاص وجہ تھی۔ آزادی کے بعد امریکی فوجی حکومت نے مزارعوں کے قانون میں تبدیلی کر دی تھی۔ اب اُنھیں نصف کی بجائے فصل کا تیسرا حصہ زمیندار کو دینا پڑتا تھا۔ اگر چہ یہ تبدیلی مزارعوں کی بہتری کے لیے کی گئی تھی لیکن اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ زمینداروں نے اُن زمینوں کو فروخت کرنا شروع کر دیا جو زیادہ منافع بخش نہیں تھیں۔ ہُو بھی اُن لوگوں میں شامل تھا جو دور افتادہ اور کم منافع دینے والے زمین کے ٹکڑے بیچنے کے بارے میں منصوبے بنا رہے تھے۔ وُہ چاہتا تھا اُس کے مزارعے ہی یہ زمینیں خرید لیں لیکن اُن کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا چنانچہ جس کے پاس بھی رقم ہو وہ یہ زمین خرید سکتا تھا۔ چوم نائے کا خاندان اس منصوبے کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس کا باپ اپنے چھوٹے سے گھر کے سامنے والے ٹکڑے پر کاشتکاری کرتا تھا اور یہ ٹکڑا ہُو کی ملکیت تھا۔ اُس نے زمین بیچنے کا اعلان کر دیا لیکن تائی چون اتنا غریب تھا کہ وُہ اُس کا ایک حصہ بھی خریدنے کی طاق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ ہو اِس زمین کو کسی اور کے ہاتھ بیچنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نیا زمیندار تو اپنے پسندیدہ مزارعوں کو زمین ٹھیکے پر دے گا اور ہُو کبھی بھی تائے چوُن کی سفارش نہیں کرے گا۔ اس وجہ سے تائے چُون کا خاندان ہُو سے ڈرتا تھا۔

اِس سدھارے گئے مزارعہ سسٹم کے بارے میں بہت ساری کہانیاں تھیں۔ مزارعوں نے اپنے کنبوں کو بھوک سے بچانے کے بارے میں بہت سوچ بچار کیا اور اُن میں سے کچھ جو ذرا تیز تھے اُنھوں نے اپنے گھر، گھروں کا سامان اور جانور فروخت کر کے بھی زمین خریدنے کی کوشش کی۔ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ اب بھی اُن کے پاس پُوری رقم نہیں ہے تو وہ سودخوروں کے پاس گئے تاکہ وُہ زمین، جو اُنھوں نے ابھی خریدنا تھی، اُسے گروی رکھ کر کُچھ رقم حاصل کر سکیں۔ ایسے قرضوں پر ماہانہ دس فیصد سے زیادہ سُود ہوتا تھا لیکن لالچی سُود خور سُود کی بجائے گروی رکھنے کے نئے نظام میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اِس نئے نظام کے تحت وُہ ہر سال فصل کا نصف حصہ حاصل کر سکتے تھے اور یُوں اس کے نتیجے میں وہ ''آدھی فصل مالک کی اور آدھی مزارعے کی'' سے زیادہ گھاٹے میں رہتے۔ بہر حال نیا نظام رائج ہو چکا ہے اور غریب مزارعین کو تو ہر صورت کھانے اور رہائش کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہے چنانچہ وُہ ہر ممکن کوشس کر دیکھتے ہیں۔ یُوں زمین خرید لینا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہاں تو ایسے سُود خور بھی کم تھے جو رقم ہی ادھار دے سکتے۔ چنانچہ اس نظام سے نہ زمیندار خوش ہوتا ہے اور نہ ہی مزارعے کی تسلی ہوتی ہے۔

چوم نائے کا خاندان غریبوں میں سے بھی غریب ترین تھا اس لیے زمین خریدنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اِس دوران ہُو کچھ اور غصیلا ہو گیا۔ صرف اس کے لیے نہیں کہ اُس کی بیٹی کی شادی ہو گئی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ کمیونزم کے پھیلنے کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ ایک ایسا نظام جو زمیندار کے لیے امریکی جمہوریت سے بھی بدتر تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے سے پوچھا، جو فوجی حکومت میں کام کر رہا تھا، کہ جمہوریت اور کمیونزم میں سے کون جیتے گا؟ اُس کے بیٹے نے جواب دیا کہ جب تک درمیانی مدت کی کوریائی حکومت نہیں بن جاتی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُسے پُرانے نظام کی بحالی کے بارے میں زیادہ اُمید نہ تھی اور جمہوریت اور کمیونزم میں سے اُسے کوئی بھی پسند نہ تھا۔ ہُو اسی وجہ سے بے چین تھا۔ چوم نائے کی مرغی اور خود چوم نائے اُس کے لیے بے چینی کی ایک وجہ بن گئے۔

گاؤں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ چوم نائے اس لیے مرگئی کہ اُس پر مُرغی کی رُوح قابض ہو گئی تھی۔ ان پڑھ لوگوں کے لیے اسی قسم کے توہمات پر یقین کر لینا بالکل قدرتی ہوا ہے۔ لیکن اُس کی موت کے حقایق سراسر مختلف تھے۔ دو دن تک چوم نائے اپنی مرُغی کو آسمان میں ٹنگے اور چلاتے دیکھ کر بے حد اذیت محسوس کرتی رہی۔ تیسری رات آئی تو وہ یہ اذیت برداشت نہ کر سکتی۔ جب سفید بادلوں میں سے چاند چمکنے لگا وہ چپکے سے گھر سے نکلی اور مُرغی کی طرف دیکھا۔ مرغی پھر چلانے لگی۔ وُہ چوری چھپے پھاٹک کے راستے ہُو کے باغ میں داخل ہوئی۔ بانس کو اتارا اور رسیاں کھول کر اپنی مرغی لے آئی۔ جونہی وہ پھاٹک کے راستے بھاگ کر جانے لگی گھر کے اندر سے ایک کھردری آواز سنائی دی۔ وہ بہت تیز بھاگ رہی تھی اس لیے گر گئی۔ پھر اُسے ایک پتھر آ لگا جو مسٹر ہُو نے اسے مارا تھا۔ بہر حال وہ پھر اٹھی اور ہُو سے خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگی۔ جب وُہ اپنے گھر پہنچی تو دروازے کے قریب بے ہوش کر گر گئی۔ اُس کے والدین باہر آئے اور اُنھوں نے دیکھا اُس کے ماتھے پر ایک زخم تھا جس میں سے خُون بُری طرح بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود مُرغی اُس کے ہاتھوں میں تھی جو تقریباً ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اُس کے والدین نے اُس کے زخم پر سویابین کی کریم لگائی۔ اُن کا خیال تھا یہ ایک معمولی چوٹ ہے جو باڑ میں گزرتے ہوئے کسی ٹہنی کے لگ جانے کی وجہ سے آئی ہے لیکن زخم کو مندمل کرنے کی بجائے سویابین کریم نے اِسے خراب کر دیا۔

اُنھوں نے مرغی کو کچھ چاول ڈالے جو وہ نہ کھا سکی اور چند گھنٹوں کے بعد ایک آخری

چیخ مار کر ہمیشہ کے لیے چپ ہوگئی۔ تب تک چوم نائے کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا اور وُہ اس کیفیت میں اپنی مرغی کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اگلی رات وہ بھی مرگئی۔ اس لیے لوگوں کو یقین تھا کہ چوم نائے پر مُرغی کی رُوح حاوی ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں وہ بھی مرگئی۔

اب اِس چھوٹے سے کمرے میں، تیل کے ٹمٹماتے لیمپ تلے، چوم نائے کے والدین، اُس کی چار بہنیں، اُس کے دادا دادی اور اُس کا منگیتر ایک جادوگرنی کے سامنے براجمان تھے۔ جس مقام پر لڑکی کی میت پڑی تھی اب وہاں سفید چاول پھیلے ہوئے تے اور کمرے کے کونوں میں چیڑ کی ٹہنیوں پر سفید کاغذ کے لمبے لمبے ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ باقی ماندہ لوگ برآمدے، راہداری اور دھان کے کھیتوں کی منڈیروں پر بیٹھے تھے۔ جادوگرنی چوم نائے کی رُوح کو بلانے والی ہے تاکہ وہ اپنے خاندان کو اپنی خواہشیں بتا سکے۔ اپنی تیاری کے دوران وہ جگہ کو پوتر بنانے کے لیے راکھ ملا پانی دیواروں اور چھت پر چھڑک رہی ہے۔ لوگوں کو پاک کرنے کے لیے وہ ان پر بھی یہ پانی چھڑکتی ہے جسکے نتیجے میں برآمدے اور کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر گندا پانی گر گیا ہے لیکن اِس موقع پر تمام لوگ جادوگرنی کے احکام کی پابندی کررہے ہیں۔ پھر جادوگرنی چیخ کر مُرغی کی روح کو جس نے چوم نائے پر قبضہ کر رکھا ہے اور دیگر تمام روحوں کو حکم دیتی ہے کہ وُہ چوم نائے کو چھوڑ دیں۔ پھر وُہ اپنی تتلیوں کی ٹوکری کو گھر چتی ہے اور اُس کا نائب، جو کہ اُس کا بھتیجا بھی ہے، جادوئی چھڑی تھامتا ہے۔ اب چوم نائے کی رُوح کو آنا چاہیے اور جادوگرنی کے ذریعے سے بولنا چاہیے۔

''میری پیاری ماں ـ ـ ـ ـ ـ ـ باپ ـ ـ ـ ـ ـ دادا، دادی۔ میری بہنو اور میرے پیارے شوہر میں جا رہی ہوں، ایک نا معلوم جگہ جا رہی ہوں اور وُہ جگہ بہت دُور ہے۔ اُس کی آواز اداس ہے اور رات کی تاریکی خاندان کے دُکھ میں اضافہ کر رہی ہے۔

''میں کتنی دُکھی ہوں کہ میں اس دنیا کو اپنے خاوند کے بازوؤں میں گئے بغیر چھوڑ رہی ہوں۔'' اُس کا منگیتر شرمندہ ہوکر اپنا چہرہ ڈھانپ لیتا ہے۔ اور اسی طرح چوم نائے کے نام پر جادوگرنی کی بکواس جاری رہتی ہے۔

''اے بدبخت مُرغی میں نے تمھیں کھلایا پلایا۔ میں نے تمھیں اذیت دینے والے کھمبے سے آزاد کروایا اور اس کے بدلے میں تم نے میری رُوح پر قبضہ کرلیا۔ ناشکری مُرغی ہمارا مالک مسٹر ہُو ناراض ہونے میں حق بجانب ہے کیونکہ تم نے اُس کا باغ خراب کردیا۔ (اس طرح جادو

گرنی ایک امیر آدمی کی طرفداری کرتی ہے۔) پیاری ماں اور باپ مہربانی فرما کر دُوسری مُرغی سے بھی نجات حاصل کر لیں۔'' اِس موقع پر نائب ایک چھڑی ہلاتا کھڑا ہوتا ہے اور مرغی کو تلاش کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ خوفزدہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ چوم نائے کے ماں باپ جادوگرنی سے وعدہ کرتے ہیں۔۔۔۔یعنی چوم نائے کی رُوح سے۔۔۔۔کہ وُہ اُس مرغی سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔

اس دوران دادا اور دادی خاموش بیٹھے رہتے ہیں، جیسے بُت ہوں۔ اِس وعدے پر نائب کمرے میں واپس آ جاتا ہے اور اپنی نشست پر بیٹھ جاتا ہے۔ رُوح پھر جادوگرنی کے مُنہ سے بولتی ہے:

''پیاری ماں، جتنی بھی چیزیں تم نے میرے مستقبل کے استعمال کے لیے تیار کی تھیں اُنھیں لوگوں میں بانٹ دو۔ وہ میرے لیے فضول ہیں۔'' نائب پھر اپنی لہراتی ہوئی چھڑی کے ساتھ اُٹھتا ہے اور اب وہ بھی رُوح کے اثر سے کُچھ کپکپا رہا ہے۔ وُہ کپڑوں کو تلاش کرتا ہے۔

چوم نائے کی ماں سسکیاں لیتی ہے۔'' میری پیاری بیٹی تم فکر نہ کرو میں مرغی سے پیچھا چھڑا لوں گی۔ تم سکون سے اپنے راستے پر جاؤ اور فکر نہ کرو۔''

نائب چوم نائے کی ذاتی اشیاء ڈھونڈتا رہتا ہے اور بالآخر اُس کی ماں شیلف پر سے ایک ڈبہ اُتار کر اُسے دے دیتی ہے۔ وُہ اُسے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور چھڑی کی مدد سے کھولتا ہے اور اُس میں رکھی چیزیں نکال لیتا ہے۔ کچھ زیادہ چیزیں نہیں ہیں۔ ایک گلابی بلاؤز اور ایک سکرٹ۔ بس یہی سب کچھ تھا۔ جادوگرنی بے حد مایوس ہوتی ہے۔ اگرچہ خاندان بہت غریب تھا لیکن پھر بھی اُس کا خیال تھا کہ اس سے تو کہیں زیادہ سامان ہوگا۔ رواج یہی تھا کہ ایسی اشیاء کو جادوگرنی کو دے دی جاتی تھیں کیونکہ یہی تو اُن کا کاروبار تھا۔ جب قیمتی چیزیں برآمد ہوں تو جادوگرنی مسرت کی انتہا نہیں رہتی اور وہ عمل جاری رکھتی ہے لیکن یہاں مایوس ہو کر وہ عمل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے اور پھر ایک آخری فقرہ سامنے آتا ہے:

''خدا حافظ ماں، باپ، دادا، دادی۔ خدا حافظ میری بہنو اور خدا حافظ میرے پیارے خاوند۔ اگرچہ تمھارے بازو میرے نصیب میں نہ تھے لیکن میرا دل ہمیشہ تمھارے لیے تھا۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔۔۔۔میں ایک نامعلوم منزل کی طرف جا رہی ہوں۔''

چوم نائے کی ماں صحن میں چلی جاتی ہے۔ وعدہ کے مطابق مُرغی پکڑتی ہے اور جادو

گرنی کے پاس لے جاتی ہے۔ شادی کے کپڑے تہہ کر کے اُس کے سامنے رکھ دیے جاتے ہیں۔
اُس صبح جب اُس کا منگیتر چوم نائے کا مُردہ جسم اُٹھا کر لے گیا کُچھ لوگوں کا خیال تھا اُن چیتھڑوں کی بجائے، جو اُس کے جسم سے لٹک رہے تھے، اُسے شادی کا جوڑا پہنانا چاہیے لیکن اُس کے خاندان کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ نئے کپڑے تو جادوگرنی کے عمل کا معاوضہ تھے۔ وُہ سمجھتے تھے یہ رسم تدفین کے بعد از حد ضروری ہے۔ ان کو یقین تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے کیونکہ یہ ایک دلھن کی موت تھی۔

اس کے بعد جادوگرنی اُس جگہ کو دیکھتی ہے جہاں مردہ جسم پڑا ہوا تھا اور اب سفید چاول بکھرے ہوئے تھے اور پھر خاندان کو بتاتی ہے کہ چوم نائے ایک پھُول میں تبدیل ہو چکی ہے جس کی شکل وُہ چاولوں میں دیکھ سکتی ہے۔ نائب چاولوں کو ایک چھوٹے سے تھیلے میں ڈال لیتا ہے۔ اب نائب اور جادوگرنی کے پاس وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو کچھ قیمت رکھتی ہیں اور وُہ رخصت ہوتے ہیں۔ ہجوم تو کب کا جا چکا ہے۔ صرف خاندان کے افراد کے بغیر کسی تاثر کے بُت بنے بیٹھے ہیں جیسے اُن پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

ہمسایوں میں سے کوئی بھی چوم نائے کی موت کا سبب نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اُنھوں نے جاننے کی کوشش کی۔ وہ مطمئن ہیں کہ مرغی کی رُوح چوم نائے میں حلول کر گئی تھی اور یہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔

یون سی
(کوریا)

مسزسن کی موت

جس وقت مسٹرسن سوز محل کی طرف گئے ان کی بیوی یون سی کڑھائی کے کام میں مشغول تھی۔ اگرچہ اس کے ہاتھ سینے پرونے میں مصروف تھے لیکن اس کا دماغ مختلف چیزوں کے بارے میں پریشانی کے عالم میں چکرا رہا تھا۔ پچھلی شب اس کا خاوند دیر سے گھر آیا تھا اور پھر نشے کی حالت میں اس نے عجیب وغریب طریقے سے آہ بھری تھی اور جس طرح اس صبح اس کا خاوند اس سے کوئی بات کیے بغیر محل کی طرف چلا گیا، جیسے کوئی مرنے جارہا ہو، مایوسی کی حالت میں ۔۔۔۔۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی وجہ سے اسے تشویش تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی بہت ہی خوفناک واقعہ ہونے کو ہے۔ اس کے خیال میں ان دنوں حکومت میں جو ہیبت ناک واقعہ ہوا تھا اس کے نتیجے میں اس کے خاوند پر بھی کوئی مصیبت آنے والی تھی۔

موت! جیسا کہ اس نے پچھلی شب سوچا تھا۔ آثار تو یہی تھے کہ اس کے خاوند کی قسمت میں موت ہی لکھی ہے۔ اس نے اپنی موت کے بارے میں بھی سوچا اور اپنے بیٹوں کی موت کے بارے میں بھی۔ جن کا شاہی خاندان پر انحصار تھا اور اس کے بعد جو کچھ بھی پیش آئے گا۔ کڑھائی کا کام کرتے ہوئے جب اس قسم کے خیالات اس کے ذہن کو پریشان کررہے تھے تو اس کی ملازمہ یامبون بھاگی ہوئی گھر میں آئی اور اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ اپنی مالکن کو آواز دی۔

یُون سی نے جب یامبون کو اس طرح گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ دہل گئی۔ خاوند کی موت کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔ اس نے کڑھائی کا کام فوراً بند کر دیا اور اُٹھ کر کہنے لگی: ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر گئی جہاں یامبون کی

سانس ابھی تک ٹھیک سے نہیں چل رہی تھی۔

''جب میں گلی میں گئی ہوں تو وہاں خاصے لوگ جمع تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ انھوں نے مجھے بتایا کہ دو وزیروں، سانگ اور باگ نے، غیر قانونی طور پر بادشاہ بن بیٹھنے والے کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا منصوبہ ظاہر ہو گیا اور اب بادشاہ خود انھیں سزا دے گا اور انھیں آج سنا مٹو لے جا کر پھانسی دے دی جائے گی۔''

یامبون اپنی داستان بڑی مشکل سے سنا سکی۔ جونہی یون سی نے یہ سب کچھ سنا تو اس کو ذہنی طور پر شدید دھچکا لگا اور اس کے اعصاب کھچاؤ کا شکار ہو گئے۔

بالآخر یامبون کی سانس درست ہوئی اور اس نے یون سی سے پوچھا۔ ''مادام'' ویسے یہ جو وزیر تھا سانگ، یہ وہی تو نہیں تھا جو اس گھر میں آیا کرتا تھا اور ہمارے وزیر مسٹر ن کے بے حد قریب تھا؟''

یون سی نے اثبات میں یوں سر ہلایا جیسے اسے جواب دینے کی کوئی پروا نہ ہو۔ یامبون چونکہ بہت پریشان تھی اس لیے اس نے پھر پوچھا: ''لیکن تمھارے خاوند کا تو اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یا ہے؟''

یُون سی نے اپنے دماغ میں ہی سوچا کہ ہاں شاید وہ ان کے ساتھ شریک ہو لیکن وہ یہ بات بلند آواز سے تو نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے خاموش بیٹھی رہی۔

اس نے سوچا ''کل اس کا رویہ بے حد مشکوک تھا اور اس کا مطلب تو یہی ہو گا۔ ۔''

اسے محسوس ہوا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہے۔ اسے اپنے خاوند کی موت کے سوا کوئی اور انجام نظر نہیں آ رہا تھا اور اپنے لیے بھی اسے موت ہی نظر آتی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے شاہی خاندان پر انحصار کرنے والے۔ اس کا جی جل گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اس سارے قضیے کے بارے میں غور کیا۔ موت اور زندگی ۔ ۔ زندگی اور موت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بڑبڑاتی رہی اور اکیلی بیٹھی رہی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی اس کے نوجوان بیٹوں کو گرفتار کر لیں گے اور انھیں مار ڈالیں گے، اور اسے اس دربار میں ملازمہ بنا لیں گے۔ اس نے اس کے بارے میں کچھ زیادہ سوچا۔ خاوند اور بیٹوں کی موت کے بعد ایک ملازمہ کی حیثیت سے زندہ رہنا کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہو گا۔ اس کے ذہن نے دہائی دی۔

''موت سے بہتر کوئی شے نہیں۔'' بے عزتی کی طویل زندگی سے موت بہت بہتر ہے۔

اس کا جی جل رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ سردی سے کانپ رہی تھی جیسے اس کے کمرے میں تیز سرد ہوا چل رہی ہے۔

خاصی دیر بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اس نے سوچا: جو شخص اعلیٰ اقدار کا مالک ہو وفاداری اور پاکیزگی اس کے فرائض میں شامل ہونی چاہیے۔ اور سب سے ایماندار شخص کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ وہ مرجانا چاہتی تھی اور اس کے ذہن نے اس بات کا تہیہ کرلیا تھا۔

اس نے اس بارے میں غور کیا کہ جب وقت آئے گا تو وہ کس طرح اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گی۔ وہ ایک خنجر اپنے سینے میں بھونک لے گی یا اپنے آپ کو کسی گہرے کنوئیں میں گرادے گی۔

اس نے دیوار کے ساتھ ایک سفید تولیا لٹکتا ہوا دیکھا اور اسے خیال آیا کہ وہ اپنے آپ کو لٹکا کر بھی تو مار سکتی ہے۔ یون سی نے اپنے گھر والوں کو گلی میں بھیج دیا۔ اس نے انھیں حکم دیا کہ وہ دیکھ کر بتائیں کہ کیا اس کا خاوند بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔ جنھیں گرفتا کیا گیا ہے اور اگر ہے تو فوراً واپس آ کر اطلاع کریں۔

اب جب کہ اس نے موت کے بارے میں فیصلہ کرلیا تھا۔ یون سی کا دماغ پُرسکون تھا۔ اس کا دل موت کو قبول کر چکا تھا اور وہ بھی سکون سے تھا۔ وہ ایک سرد نیلے چاند کی طرح تھی جو باوجودیکہ سیاہ بدلیوں میں گھرا ہوتا ہے اور وحشی ہوائیں اور خوفناک بارشیں اس پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ وہ اپنی زرد کرنیں بڑے سکون سے دنیا پر نچھاوڑ کرتا رہتا ہے۔

یون سی نے سب سے زیادہ صاف ستھرا سوتی تولیہ دیوار سے اتارا اور گھر کی سب سے اوپر والی منزل پر چلی گئی۔ اس نے تولیے کو دوحصوں میں لپیٹا اور موٹے شہتیر کے ساتھ لٹکا دیا۔ یوں اس نے اپنی موت کی پوری تیاری کرلی۔ سوتی تولیے کو پکڑنے کے لیے وہ اپنی ایڑیوں کے بل کھڑی ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ دیکھنے کی بھی کوشش کی کہ باہر گلی میں کیا ہو رہا ہے لیکن یہاں سے صرف ہمسایوں کی چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گلی میں سے بلند ہوتی آوازوں کو سننے کی کوشش کی لیکن وہ کسی ایک آواز کو بھی پہچاننے میں ناکام رہی۔ وہ صرف ہوا کے ساتھ آنے والے شور کو سن سکتی تھی۔

ملازمین، جنھیں گھر سے باہر بھیجا گیا تھا، واپس آئے اور انھوں نے تفصیل بتائی۔

''وزیر سانگ اور وزیر باگ کی بگھیاں ابھی ابھی گزری ہیں۔''

جب یون سی نے یہ سنا تو اسے یقین ہو گیا کہ اگلی بگھی اس کے خاوند کی ہوگی۔ اس نے کچھ کہے بغیر سر ہلایا اور ملازموں کو دوبارہ گلی میں بھیج دیا تاکہ وہ وہاں کی خبر رکھ سکیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم واپس آیا اور یون سی نے اس سے پوچھا کہ اب کون آیا ہے؟

''وزیر ایلا اور شاہی استاد کی بگھیاں ابھی ابھی گزری ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

یون سی نے اسے دوبارہ گلی میں بھیج دیا۔

ملازم ایک مرتبہ پھر واپس آیا۔ بڑے سانگ صاحب یعنی وزیر سانگ کے والد صاحب کی بگھی بھی گزری ہے۔

یون سی حیران تھی کہ آخر اس کے خاوند کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ملازم کو گلی میں بھیجا اور اسے یقین تھا کہ اب اس کے خاوند کی بگھی ضرور گزرے گی۔

تھوڑی دیر بعد ملازم پھر واپس آیا اور کہنے لگا۔ ''جنرل یون کی بگھی ابھی گزری ہے''۔

یون سی نے بے چینی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ شاید اس کا خاوند محل میں ہی مارا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ملازموں کو بالکل ٹھیک ٹھیک معلومات حاصل کرنے کے لیے خبردار رہنے کا حکم دیا۔

اس دوران شام ہوگئی اور پر شور گلی آہستہ آہستہ خاموش ہوگئی۔

شام کے وقت ملازم واپس آئے اور انھوں نے بتایا کہ شاہی دربار سے وابستہ تمام افراد بگھیوں میں لے جائے گئے ہیں اور گلی میں جمع شدہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ''ہم نے سوچا شاید ہم غلطی پر ہیں۔ چنانچہ ہم نے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھا کہ وہاں سے گزرنے والی بگھیوں کی کل تعداد کتنی ہے۔ انھوں نے بھی اتنی ہی بتائیں جتنی ہم نے گنی تھیں۔

یون سی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا یقیناً اس کا خاوند محل ہی میں مارا گیا ہے۔ وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اذیت سہتے اور مرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے خاوند کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا جس کے بال کھلے ہوئے اور پریشان تھے اور ان پر خون لگا ہوا، جو اپنے اعضاء کو آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا حتی کہ اس کا دل ٹوٹ گیا اور سانس رک گئی۔

اس نے چند ملازموں کر ہر ممکن تفصیل حاصل کرنے کے لیے محل کی طرف دوڑایا۔

جب وہ بیٹھی انہی مصیبتوں کے بارے میں غور کر رہی تھی تو اس نے ایک دم گلی میں کچھ شور سنا۔ کوئی چیخ رہا تھا کہ اعلیٰ حکام کے لیے راستہ دو۔

''ہنگ ہو۔ ہنگ ہو''۔

''اوئے پیچھے ہٹ جاؤ۔ بھاگ جاؤ''۔

''وہاں کھڑے ہو جاؤ۔''

''ادھر بیٹھ جاؤ۔''

''خاموش''

''اوئے تم وہاں کھڑے ہو جاؤ اور وہاں بیٹھ جاؤ۔''

''خاموش''

''ہنگ ہو۔ ہنگ ہو''

''جو ملازم باہر کھڑا تھا بھاگتا ہوا اندر آیا اور چیخ کر بولا:

''مادام، مالک تشریف لا رہے ہیں۔''

یون سی اپنے خاوند کی واپسی کا سن کر بے حد حیران ہوئی جو اب بھی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ محل میں مارا گیا ہے۔ وہ ایک لمحے میں جان گئی کہ یقیناً اس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ تو مرنے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اب اس کے اندر اپنے خاوند کی اس کمزوری نے اداس کر دیا۔ اس کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ صرف اس کا خاوند زندہ ہے اور واپس گھر آیا ہے جب کہ اس کے تمام دوست گرفتار کر کے پھانسی چڑھانے کے لیے لے جائے جا چکے ہیں۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش میں مفلوج ہو کر رہ گئی۔

عین اس لمحے درمیانے پھاٹک کا اندرونی دروازہ ایک پرشور طریقے سے کھلا اور سنگ زو اندر آ گیا۔

یون سی بے حس و حرکت اسی مقام پر بت بنی کھڑی رہی جہاں وہ سارا دن کھڑی رہی تھی اور سامنے گھورتی رہی۔ جب سنگ زو جھکا ہوا چوکھٹ کے قریب پہنچا۔ وہ کہنے لگی: ''تم واپس کیوں آ گئے ہو! مرے کیوں نہیں؟''

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ سر جھکا کر بڑبڑایا''۔ اپنے بیٹوں کی وجہ سے۔۔۔۔''

اس کا چہرہ نفرت انگیز دکھائی دے رہا تھا اور اس کی بیوی خاوند کی بے وفائی پر ناراض تھی۔ اس کا وہ منہ جو کبھی یہ کہتے نہ تھکتا تھا کہ دربار پر انحصار کرنے والے کو دربار کا غلام نہیں ہونا چاہیے اب اس کی بیوی کی آنکھوں میں گوبر کے ڈھیر سے بھی زیادہ غلیظ دکھائے دے رہا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ اس کا احساس کیے بغیر کہ وہ کیا کر رہی ہے اس نے اپنے خاوند کے منہ پر تھوک دیا۔

اس شدید بےعزتی کے بعد سُنگ زو خاموشی سے اپنی مطالعہ گاہ میں چلا گیا۔

اگلی صبح جب پو پھٹ رہی تھی باغ کی صفائی کے لیے آنے والے ملازم نے اپنے سامنے گھر کی مالکہ کی اکڑی ہوئی لاش دیکھی۔ یون سی نے اپنے گھر کی سب سے اونچی منزل کے شہتیر سے بندھے سفید تولیے کے ساتھ لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔

کھامسنگ سری ناک
(تھائی لینڈ)

سیاہ چشمہ

وہ ایک عام ملاقاتی کی نسبت زیادہ آشنا تھا اگرچہ اس کے بارے میں صرف جانا گیا تھا اسے دیکھا نہیں گیا تھا۔ وہ اکثر اپنی غیر مرئی ٹانگوں سے ماں کے دل میں اُترتا اور پھر اسے چھوڑ جاتا، ہمیشہ کی طرح بے چہرہ۔ وہ آتا رہا اور جاتا رہا لیکن وہ نہ جان سکی کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ کبھی وہ نصف شب کے قریب آجاتا اور کبھی صبح سویرے آدھمکتا اور شام تک ٹھہرا رہتا۔ یہ دھان کے کھیتوں میں بھی اس کے پیچھے جاتا اور جب وہ آگ کے لیے پتے اور لکڑیاں جمع کرتی تو وہ اس کے ساتھ رہتا۔ وہ ہر ایک سے نہیں ملتا تھا، صرف انہی لوگوں سے ملتا تھا جنھیں وہ اچھی طرح جانتا تھا مثلاً اس سے اور باپ سے بھی۔

چند روز پیشتر جب وہ مندر کے جشن کی تیاری میں مصروف تھی وہ غائب ہو گیا اور اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کب واپس آیا یا یہ وہ کہاں سے آتا ہے۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے بون پنگ کے لیے ایک نیا سارونگ سی رہی تھی جب جنگل میں سے ایک سنکھ کی آواز گونجتی ہوئی آئی۔ اس نے اپنا کام چھوڑ دیا اور کھیتوں کے اوپر دیکھا جہاں دوپہر کے نیلے آسمان کی نرم دھوپ کو پریشان کرنے کے لیے نہ ہوا تھی نہ بادل۔

دھیمی لیکن اداس گونج سارے منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں پلٹا کر اپنے آس پاس کے خالی پن کو دیکھا۔ بون پنگ کا کمبل برآمدے میں بچھے دری پر ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا جس پر وہ سویا کرتا تھا۔ اس سے پرے اس کے اور اس کے خاوند کے کمرے کے ساتھ

بانس کی ایک دیوار تھی اور اس کے ساتھ پکا کمرہ تھا، جس کی لکڑی کے تختوں کی دیواریں تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور وہ خالی تھا۔ وہ دیر تک اسے گھورتی رہی اور شاید تبھی وہ کرب اس کے جی میں گڑ گیا۔ اگر آس پاس کوئی بھی سانس لینے والی شے ہوتی تو وہ اکلاپے کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتی۔ چھت کے شہتیر کے ساتھ چمٹی ایک چھپکلی، اس کے سر کے قریب سے گزرتی کوئی بھڑ۔۔۔۔ کوئی بھی چیز۔۔۔۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھر کے سامنے والے درخت کے ساتھ جو پیلی چڑیا چمٹی رہتی تھی وہ بھی جا چکی تھی۔ اس کی غیر موجودگی نے اسے ایک اور پرندے کی یاد دلائی جسے وہ بھول چکی تھی اور جس کا پنجرہ چھجے کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر اس نے کچھ سکون محسوس کیا اور جونہی وہ قریب آئی پرندے نے اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا اور گردن لمبی کر کے کوکنے لگا۔ اپنی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں سے بے خبر اس نے گہرے سائے میں آئے ہوئے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کا باپ اکثر بے حس و حرکت کھڑا رہتا اور اتنی دیر تک کھڑا رہتا کہ وہ اس کے بارے میں فکرمند ہو جاتی کہ اسے ہوا کیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن آج پیشتر اسے کبھی پتا نہیں چلا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا۔

اس حقیقت پر مشکل سے یقین آتا تھا کہ آج کے دن اس جشن کو گزرے تین برس ہو چکے تھے شاید آج کے دِن تو نہیں۔۔۔۔۔ دراصل اس موسم سے کئی ماہ پیشتر، کاشت کے بعد، ایک چمکتی دوپہر میں یہ سب کچھ شروع ہوا۔ وہ اور اس کا خاوند جلد لوٹ آئے اور انھوں نے اپنے گھر کے سامنے آم کے درخت کے نیچے ایک کار کھڑی دیکھی۔ وہی کار جس نے متعدد بار ماں کو دُھول کے ایک بادل میں لپیٹ دیا تھا۔ اس سے اُڑتی ہوئی گرد میں وہ اسے صاف تو نظر نہیں آتی تھی لیکن وہی تھی۔ یہ ڈونگ کیم کے دیہاتیوں کے لیے ایک نئی چیز تھی اور ماں افواہوں کے ذریعے سے جانتی تھی کہ یہ انجینیر کی کار ہے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ لوگ کب آئے تھے لیکن انھیں اپنی بیٹی کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ انھیں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ باپ سیدھا گھر میں چلا گیا تھا جب کہ ماں آموں کو سنبھال رہی تھی اور اس کے ساتھ اپنی بیٹی پر نظر رکھ رہی تھی جو کرگھے پر بیٹھی کپڑا بُن رہی تھی۔ وہ دو شخص، جو لمبی آستینوں والی نیلی قمیصیں اور ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے، اس کے پاس کھڑے تھے اور سازشی انداز میں مسکرائے جا رہے تھے چونکہ وہ دونوں سیاہ چشمے لگائے ہوئے تھے اس لیے ماں یہ نہ جان سکی کہ ان کی عمریں کیا ہیں۔

''تم تو پیدائشی حسینہ ہو، کام خام۔۔'' کرگھے اوپر جھکے ہوئے شخص نے کہا۔

''واقعی ایک حُسن پری۔۔۔۔'' پہلے کے دوست نے ہاں میں ہاں ملائی۔

ماں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہاں رُک کے رہنا مناسب ہے یا گھر کے اندر چلے جانا۔

کام خام، جس کی بولی میں ''حُسن'' کے لفظ کا مطلب دن کا ایک خاص وقت تھا کہنے لگی۔ ''نہیں نہیں میں تو دوپہر کو پیدا ہوئی تھی۔''

''یونہی سہی، پھر بھی تم حُسن پری پیدا ہوئی تھی۔''

''نہیں تم نہیں سمجھے۔'' اس نے ارغوانی دھاگے کی چرخی کپڑے پر رکھی، اپنے بال ماتھے سے ہٹائے اور سیاہ چشموں کی طرف دیکھا۔ ''تم میری بات کیوں نہیں سُنتے ؟ میں تمھیں بتا رہی ہوں کہ میں دوپہر کے وقت پیدا ہوئی تھی۔''

نوجوانوں کی آنکھوں نے مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا اور لڑکی بولے چلی گئی۔ ''میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میں جب اس کے پیٹ میں تھی تو دھان کاشت کرتے ہوئے کھیتوں میں اسے درد زیادہ شروع ہوگیا تھا اور میرا باپ اسے واپس گھر لے آیا تھا اور میں دوپہر کے وقت پیدا ہوئی تھی۔۔۔۔ کیوں ماں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟''

عورت اپنی ہی بیٹی کی طرف سے ایک گواہ کی حیثیت سے طلب کئے جانے پر گڑ بڑا گئی۔

''ہاں بالکل دُرست۔۔۔۔'' ماں کی آواز اونچی نیچی ہو رہی تھی، ''کام خام دوپہر کے وقت پیدا ہوئی تھی، اب سے کچھ دیر بعد۔''

وہ گفتگو کے دوران درختوں کی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے سورج کی بلندی کا اندازہ لگاتی رہی لیکن اس سے پیشتر کہ وہ گفتگو جاری رکھتی باپ نے مکان کے اوپر سے مداخلت کی ''احمق! تم دونوں ماں بیٹی احمق ہو۔۔۔۔۔۔ یہ دونوں نوجوان تو تھائی زبان میں صرف یہ کہہ رہے تھے کہ یہ خوبصورت ہے۔''

باپ کی آواز کا لہجہ خوشگوار نہیں تھا اور اس نے بات بھی مختصر کی۔ رات کھانے پر ماں نے دیکھا کہ باپ اپنی بیٹی کی طرف ایسے دیکھ رہا ہے جیسے اسے کچھ بتانا چاہتا ہو لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ اس رات چاند نہیں نکلا تھا۔ باپ برآمدے کے آخر میں اکیلا بیٹھا رہا۔ وہ آدھی رات کے بعد ہی سونے کے لیے اندر گیا تھا، اس کمرے میں جس کی دیواریں باقاعدہ لکڑی کے تختوں کی تھیں۔ ماں نے رات کے اسی حصے میں کام خام کی بے چین کروٹوں کی کسمساہٹ سنی۔ گاؤں

والوں کی طرح ماں بھی بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر باپ اپنی بیٹی کے ساتھ بہت لگاؤ رکھتا ہے تو یہ صرف اس لیے نہیں کہ وہ اکلوتی اولاد ہے بلکہ اس کی کچھ اور وجوہات بھی تھیں۔ ڈونگ کام گاؤں میں آنے سے پہلے اس کے خاوند نے ایک جگہ سے دوسری جگہ اتنی بار ہجرت کی تھی کہ اسے اس کی عادت ہوگئی تھی۔ لیکن جب وہ ڈونگ کام پہنچے تو اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ کہیں نہیں جائیں گے اور دھان کے کھیت کی صفائی کرنے چلا گیا تھا۔ جب اگلے برس کام خام پیدا ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اس کا نام خود رکھا اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کیوں کہ اس نے پہلے کبھی اپنے بچوں کے نام خود نہیں رکھے تھے۔ اور جب بچی کمزور رہ گئی تو اس نے اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرایا کہ اس نے اپنی بیوی کو سخت کام پر لگائے رکھا۔ اسے کام خام سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ ہر قیمت پر اسے مشقت آمیز کام سے بچانا چاہتا تھا اور اس وجہ سے اس کے ہمسائے اور گاؤں کے لونڈے اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ان کا مکان دھان کے کھیتوں کے کنارے الگ تھلگ واقع تھا اس لیے وہ خاص طور پر اس کے گرد باڑ لگاتا تھا۔ ایک روز چند مقامی لڑکے جو اسے تنگ کرنے میں بہت لطف لیتے تھے، باڑ کے باہر کھڑے ہو کر کہنے لگے: ''باڑ کانٹوں سے بنائی جاتی ہے نرم بانس سے نہیں جو تم نے لگائے ہیں۔'' اگرچہ وہ کسی کے مشورے پر عمل کرنے والا شخص نہیں تھا لیکن اگلے ہی روز وہ جنگل میں گیا اور باڑ کو مضبوط کرنے کے لیے نوکدار بانس کھود لایا۔ جو سڑک بنائی جارہی تھی اس نے دور دراز کے دیہاتوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے گاؤں کے ہر گھر کو بھی ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔ اس سے لڑکوں کو اسے چھیڑنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ''کانٹے بیلوں اور لڑکوں سے تو بچا سکتے ہیں لیکن کاروں کا کیا ہوگا۔''

باپ کی پریشانی تب شروع ہوئی جب بارش کے بادلوں سے آسمان خالی ہو گیا۔
ڈونگ کام ایک دور افتادہ گاؤں نہ رہا۔ گاؤں والے نئی سڑک کی تعمیر سے بے حد خوش تھے۔ وہ اب کانی کی دوکان کے چھجے تلے جمع ہوتے اور اب وہ پہلے سے زیادہ باہر جانے لگے تھے۔
نوجوان نسل، لڑکے اور لڑکیاں تعمیراتی سامان سے لدے ٹرکوں پر بیٹھ کر ضلعی قصبے تک چلے جاتے اور جب وہ واپس آتے تو انھوں نے شوخ وشنگ رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ باپ پہلے سے زیادہ مندر جانے اور بہت لیے دیے رہنے لگا تھا۔

''اگر ممکن ہوتا تو میں اسے ملتوی کر دیتا۔'' وہ اس میلے کے بارے میں بات کر رہا تھا جو ہر برس کے چوتھے مہینے میں منایا جاتا تھا۔ ''اگر کسی کو بھی کوئی دلچسپی نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے۔''

لیکن اس کا اندازہ غلط تھا۔ بہت جلد لوگوں کو نئی چیزوں کی عادت ہوگئی۔ وہ اجنبیوں اور سڑک پر ٹریفک کے عادی ہو گئے اور انھوں نے پھر جشن کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ اگر چہ وہ پہلے والی بات اب نہ تھی۔ اس مرتبہ اس کا آغاز سرخ اور سبز رنگ کے کارڈوں سے ہوا جو قصبے سے چھپوائے گئے تھے اور یہ کارڈ تمام خاندانوں کو یہاں تک کہ گاؤں سے باہر رہنے والے لوگوں کو بھی بھجوائے گئے تھے۔ جشن کی رات جو مندر اس سے پیشتر مشعلوں اور اگر کی روشنی سے گلابی اور گرم ہوا کرتا تھا اسے اب ایک جنریٹر سے پیدا ہونے والی بجلی کی چندھیانے والی روشنی سے جگمگایا گیا تھا اور اس میں لوگ اور موسیقی بھری ہوئی تھی۔ چبوترہ، جو اس سے پیشتر کیلے کے تازہ پتوں، کماد اور جنگلی پھولوں سے سجا ہوا اور تازہ تازہ لگا کرتا تھا اب اس پر کئی رنگوں والا بھڑکیلا سیلوفین مڑھا گیا تھا۔ مندر کے احاطے میں کاروں، ٹرکوں اور بسوں کی بھرمار تھی۔ پروہت کا وعظ لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے اتنا بلند تھا کہ آس پاس کے کئی دیہات میں سنا جا سکتا تھا۔

ماں کا بہکتا ہوا دماغ ایک لمحے کے لیے پھر سینے پرونے کی طرف منتقل ہوا لیکن فوراً ہی پرندے کے پنجرے کی طرف چلا گیا۔

اس کی آنکھیں چمکدار سرخ اور چھوٹی تھیں۔ جب بھی ماں حرکت کرتی وہ اپنا سر ہلاتا اور کوکتا۔ بڑے سنکھ کی آواز پھر گونجی۔ اگر چہ اب بھی اس کی آواز پہلے کی طرح نرم تھی لیکن اکلاپے کا تاثر زائل ہو چکا تھا۔ اس نے پنجرے کے پار دھان کے کھیت کو دیکھا جہاں کچھ لوگ درختوں سے نکل کر پرے جا رہے تھے۔ سنکھ کی آواز کے بار بار آنے لگی اور اس کے ساتھ وقفے وقفے سے ہجوم کے نعرے سنائی دینے لگتے۔ جونہی وہ قریب آئے اس نے آگے آگے آنے والی پالکی کو دیکھا جس میں بوڑھا پروہت بڑی سنجیدگی سے براجمان تھا۔ دو ایسے شخص بھی تھے جو مسخرے پن سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے، ان کے لبادے سبز اور ارغوانی تھے اور وہ وسانندرا کے بچوں کی اداکاری کر رہے تھے جو بعد میں بدھ ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے گاؤں والے پھول اور جنگلی درختوں کی ٹہنیاں لیے چلے آ رہے تھے۔ اس کا خاوند سب سے پیچھے سنکھ اٹھائے ہوئے آ رہا تھا۔ وہ انھیں تب تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ گاؤں کے موڑ پر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد مندر کے ڈھول کی گہری آواز آئی جو دنیا کو بتا رہی تھی کہ مہاتما بدھ پچھلے جنم سے لوٹ آئے ہیں۔ اس کے بعد منبر کو پھلوں اور پتوں سے سجایا جانا تھا۔

ماں کو اب یاد نہیں تھا کہ چھوٹا پرندہ کب ان کی چھت پر اُترا تھا۔ اس لیے اندازہ لگایا

کہ شاید تب کی بات ہے، جب وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ چاند گھٹ رہا ہے یا بڑھ رہا ہے اور اس کا خاوندان دنوں چُپ رہتا تھا۔ جب اس کے دکھ میں کچھ کمی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ پرندے کے پنجرے کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے لیکن اس نے کبھی اس سے دریافت نہ کیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ دراصل وہ پہلا دن تھا جب اس نے پرندے کوغور سے دیکھا تھا۔ ایک پیاری شے جولگتا تھا ٹالکم پاؤڈر سے بنی ہوئی ہے۔ وہ اس چھوٹے سے پرندے سے بے پناہ پیار کرنے لگی۔ اور اب وہ اپنے خاوند کوبھی سمجھنے لگی تھی۔ اس کی ظاہری لاپروائی کی وجہ بیٹی کی گم شدگی تھی۔ یہی اس کی بیاری کی وجہ تھی۔ اس کا دل دکھ کے بوجھ تلے ڈوبنے لگا۔

تین برس پیشتر کے اس جشن کے بعد اسے یقین تھا کہ اس کا خاوند دوبارہ مندر نہیں جائے گا اور نہ ہی وہ دوبارہ ایسا شاندار جلوس دیکھے گی جو ابھی گزرا تھا۔ کھیت ابھی تک اجلے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ دکھ، وقت کے ساتھ، اگر زندگی ہو تو کم ہو جاتا ہے۔ باپ سورج ڈوبنے سے پیشتر گھر آ گیا۔ اگر چہ وہ تھکا ہوا تھا لیکن تقریب کے بعد اس کا چہرہ حمانیت سے بھرپور تھا۔ اس کے ہاتھ میں زعفران کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو پنجرے کے قریب دیکھا تو تھوڑا سا ہچکچایا۔

''یہ کتنی چھوٹی سی پالتو چیز ہے۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے اس کے پاس اس سے بہتر کہنے کو اور کچھ نہ تھا۔

''ہاں یہ ہے۔''

''اسے اتنے عرصے تک پنجرے میں بند رکھنے کا ارادہ تو نہیں تھا۔ تمھیں پتا ہے میں چاہتا تھا کہ اس کے پر اُڑان کے قابل ہو جائیں تو میں اسے آزاد کر دوں۔ تین سال بیت گئے ہیں۔ میں نے اسے خاصی اذیت دی ہے، کتنی شرم کی بات ہے۔''

''ہاں'' ماں نے صرف یہی کہا۔

اگلی صبح پرندے پر زعفرانی پانی ڈالنے کے بعد، کہ یہ خوش قسمتی کے لیے تھا، وہ اسے مندر لے گیا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ وعظ سنتا رہا۔ جب ابواب کے خاتمے کا سنکھ بجا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ تین بار پروہت کی طرف جھکا اور پھر رینگتا ہوا منبر کے پاس چلا گیا جہاں پنجرہ پڑا تھا۔ جب پرندے نے اسے دیکھا تو نرمی سے کوکنے لگا۔

وہ خوشی سے مسکرادیا۔۔۔۔اس کا ہمسایہ چونچ کٹکٹانے لگا۔

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا: ''پرندے کو آزاد کرنے میں میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

''تو کرو آزاد۔''

''یہ میرا گناہ ہے کہ میں نے اسے اتنا عرصہ پنجرے میں بند رکھا۔''

باپ نے پنجرے کو مندر سے اٹھایا اور بو کے مقدس درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے کھیت کو پار کر کے اسے باڑ کے ساتھ زمین پر رکھ دیا۔ چند بچے اس کے پیچھے پیچھے یہ دیکھنے چلے آئے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ''خدا کرے کہ اب ہماری مشکلات کا خاتمہ ہو جائے'' وہ بڑبڑایا۔ اُس نے اپنا ہاتھ پنجرے کے دروازے کی جانب بڑھایا۔ ''جنگل میں جاؤ۔ اپنی مادہ کی مدد کرو کہ وہ تمھارے ان۔ڈے سیے، اپنے بچوں کو گھاس کے بیج کھلاؤ۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔ چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ جہاں تک جا سکتے ہو۔ اس نے پنجرے کو آرام سے تھپتھپایا لیکن پرندے نے اس ڈنڈے کو پکڑے رکھا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ پھر ایک ہی لمحے میں چھوٹا سا گلابی رنگ کا پرندہ اچک پنجرے سے باہر آ گیا۔ دھوپ میں اس کی باریک ٹانگیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سارے بچے دیکھنے کے لیے قریب آ گئے۔ اس نے اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا لیکن چند گز کے بعد وہ زمین پر گر گیا۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے اس کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ دوبارہ اُڑا اور تقریباً بیس گز تک اُڑتا چلا گیا۔ تیسری کوشش پر وہ بانس کی ایک ٹہنی تک پہنچ گیا اور وہاں بیٹھ کر اپنے پروں کو چونچ کے برابر کرنے لگا۔ وہ مندر میں ہی ٹھہرا رہا تا کہ وہ دوپہر کے بعد منبر، اور دوسری چیزوں کو سنبھالنے میں مدد دے سکے۔ اس نے سوچا اگر اس کی خوشی کا وزن پتھر کے باریک ٹکڑوں کے برابر ہوتا تو بھی اس روز اس میں اسے گھر تک اٹھالے جانے کی طاقت نہیں تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہوا میں تیر رہا ہے۔ اوپر صاف آسمان تھا اور آس پاس کی زمین خوبصورت تھی۔ بھینسوں کی دیکھ بھال کرنے والے بچے خوشی سے کھیل رہے تھے۔ اسے گھر پہنچ جانے کا پتہ بھی نہ چلا۔ اس سے پیشتر کہ وہ سیڑھیاں چڑھتا اسے بون پنگ کی پکار سنائی دی اور وہ جکڑ کر رہ گیا۔

''پاپا آج تو قسمت نے میرا بہت ساتھ دیا۔'' اس نے اپنا انعام بڑے فخر سے باپ کی آنکھوں کے سامنے کیا۔ ''یہ موٹا اور بیوقوف تھا۔ میں نے اسے ایک چھڑی سے مار گرایا۔''

لڑکے نے اپنا شکار باپ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور باڑ کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: ''باجی۔۔۔۔۔ کام۔۔۔۔۔۔۔ کام۔۔۔۔۔''

باپ بے سُدھ سا اپنی بیٹی کو دیکھنے لگا جو غیر یقینی انداز میں راستے پر چلتی آ رہی تھی۔
ماں اوپر سے نیچے آئی اور رونے لگی۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے ہاتھ پر رکھے چھوٹے سے پرندے کو دیکھنے لگا جس کے پروں تلے ابھی زعفران لگا ہوا تھا۔

نگوئن تھی
(جمہوریہ ویت نام)

رخصتی

نِگا اُس وقت آٹا پیس رہی تھی جب چن اُسے خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ اُس نے اپنے کندھے کو جھٹک کر بالوں کی ڈھلٹ پرے کی جو اُس کی گردن کو چھو رہی تھی اور پھر اپنی سہیلی کی جانب سے حیرت سے دیکھا ''تو کیا تم واقعی جا رہی ہو؟''

''ہاں۔'' چن نے جواب دیا۔ ''میں جشن کے دوسرے روز جاؤں گی۔''

''اوہ خدایا۔۔۔!''

دونوں سہیلیاں بغل گیر ہو گئیں۔ جوں جوں جدائی کا لمحہ قریب آتا گیا توں توں پرانی یادیں تازہ ہوتی گئیں۔ چن کی جانب دیکھتے ہوئے نگا بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایسے لمحات گزار چکی تھیں۔ جو بھلائے نہیں بھولتے۔خصوصاً وہ دن جب وہ دونوں ایک ''جنگی نقطۂ نظر سے اہم گاؤں'' کو تباہ کرنے کے لیے گئی تھیں۔ واپسی پر، رات کے وقت، دشمن کے حملے کے ڈر سے وہ پانی سے بھرے ہوئے کھیت کے درمیان میں بطخیں پالنے والے ایک شخص کو جھونپڑے میں سوئی تھیں۔ اگلی صبح جب وہ بیدار ہوئیں تو ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ اور تب وہ راتیں بھی تھیں

جب وہ ایک دوسری کے راز سنتی تھیں: ہنستے ہوئے اور کبھی روتے ہوئے اور بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلی جاتیں اور وہ دن جب وہ منڈی کی طرف جاتے ہوئے دشمن کے اڈے نگایا کے قریب سے گزری تھیں اور خفیہ پمفلٹ گر گئے تھے اور ہوا اُنھیں پوری سڑک پر اُڑاتی رہی تھی۔ اسی طرح بے شمار یادیں تازہ ہوتی گئیں: ماضی میں سے جھانکتیں، غائب ہو جاتیں، واپس آتیں اور ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتیں۔ یک دم نگا نے اپنی سہیلی کے گھٹنے کو تھپکا: ''تم کتنی خوش ہو گی۔'' اُس نے کہا۔

اُنھوں نے ایک دوسری کی جاب دیکھا اور اُن کی ہنسی چھوٹ گئی۔

چن اُس مقام کی طرف بھاگی جہاں اُس کی سہیلی ہا ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھی دشمن کے جہازوں کا دھیان رکھ رہی تھی۔ وُہ نیچے اُتر آئی۔

''کیا تمھیں بھی بلاوا آ گیا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔ ''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''ہم تینوں نے رجسٹریشن کروائی ہے۔۔۔۔۔۔تو پھر صرف تمھیں کیوں بُلایا گیا ہے؟''

وُہ حفاظتی پہرے پر تعینات نہ ہوتی تو یقیناً کامریڈ ویٹ سے جا کر پوچھتی جو گوریلا یونٹ کا سربراہ تھا۔ ہا عورتوں میں سب سے زیادہ نوجوان گوریلا تھی۔ اُن کو امریکی بمباری کی بالکل پروا نہ تھی صرف یہ ڈر تھا کہ کہیں دشمن کے جہاز اُس کے سَر پر آ کر نہ گر پڑیں۔

''کیا تُم اُنھیں کہہ سکتی ہو کہ وُہ مجھے بھی تمھارے ساتھ جانے دیں۔'' اُس نے چن سے کہا۔

''ضرور۔''

''ہم نے جو علاقے آزاد کروائے ہیں وہ بہت بڑھ گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔فکر نہ کرو اماں۔''

آٹے پر مکیاں پڑنے کی آواز بالکل ویسی تھی جیسی چھوٹے بچے ہن کے بنائے ہوئے مٹی کے گرینیڈوں سے آتی تھی۔ گاؤں کے آس پاس دشمنوں کی تمام چوکیوں کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ کئی اور دیہات میں بھی یہی ہوا تھا۔ اب سفید بگلے کے ضلعے کے ایک کونے سے لے کر

دوسرے کونے تک بے خطر پرواز کر سکتے تھے۔ یہ کہا جار ہا تھا کہ این۔ ایف۔ ایل۔ بڑے پیانے پر حملے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ گاؤں کے گوریلا یونٹ کے سربراہ کے طور پر جنگ میں حصہ لینے کے لیے اس نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ ِنگا، ہا اور دوسرے رنگروٹ کٹھ پتلی فوجیوں سے دو دو ہاتھ کر سکتے تھے گرچہ کٹھ پتلوں کو امریکی امداد بھی حاصل تھی۔ وُہ مردوں کے ہمراہ رات کو دریا عبور کریں گی اور ضلع مرکزوں کے کامریڈوں کے ساتھ جا ملیں گے۔

''اماں، میرا خیال ہے فرنٹ نے جو زمین ہمیں الاٹ کی ہے اُس پر تمہیں گنا اُگانا چاہیے۔''

''اُس کے بارے میں فکر نہ کرو۔ تم جا کر اچھی طرح سے لڑو۔''

ماں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اُسے یک دم احساس ہوا کہ وہ اس طرح گفتگو نہیں کر رہی جیسے کہ عموماً کیا کرتی ہے۔ اِس گھر میں ہمیشہ سے وُہ اُسے بتایا کرتی تھی کہ اُسے کون سا کام کیسے کرنا چاہیے لیکن اب اُس کی بیٹی اُسے نصیحت کر رہی تھی۔ حال ہی میں فرنٹ نے اُسے دو کونگ زمین الاٹ کی تھی۔ تقریباً بیس کونگ زمین اُس حفاظتی علاقے میں سے حاصل کی گئی تھی جہاں دشمن کی چوکیوں کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ اب بچے آزادی سے وہاں کھیل سکتے تھے اور بھینسیں چرا سکتے تھے تا کہ دشمن کے جہاز نہ آ جائیں۔ اِس دوران جنھیں زمین الاٹ کی گئی تھی وُہ اُسے کاشت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

''تم کہاں جاؤ گی؟ صوبائی صدر مقام میں یا آزاد کردہ علاقے میں؟'' ماں نے پُوچھا۔

''میں وہیں جاؤں گی جہاں مجھے بھیجا جائے گا۔ تم گنا ہی اُگاؤ گی نا اماں؟''

''ہاں''

''اگر تمبا کو کاشت کرو گی تو تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اُسے سیراب کر سکو۔''

ماں کو یاد آیا کہ جب اُنھوں نے تمبا کو کاشت کیا تھا تو اُس کی بیٹی روزانہ کھیت کو پانی دیتی تھی اور شکایت کا لفظ بھی اُس کی زبان پر نہ آتا تھا۔

''میں شاید ہمت کرلوں۔'' ماں نے جواب دیا۔ ''بس تم اپنی روانگی کی تیاری کرو۔''

چن جس وقت فوج میں جا رہی تھی عین اُسی وقت گاؤں میں نئے قمری سال کے جشن کی

تیاری ہو رہی تھی۔ دن میں دو تین مرتبہ دشمن کے ہیلی کا پٹر'' جوابی کارروائی'' کرنے کے لیے گوریلوں پر حملہ آور ہوتی اس کے باوجود کیک بنائے جا رہے تھے۔

خواتین کے گوریلا یونٹ نے بہت عرصہ پہلے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے درخواست دی تھی۔ اس وقت جب دشمن نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہر دوپہر'' ڈان وے'' پھیرے دار بالوں کو بنائے ہوئے، دھوپ کے چشمے لگائے اور امریکی سگرٹوں کے کش لگاتے ہوئے پریڈ کرتے۔

'' کیا میں تمھارے لیے ایک جھولنے والا تھیلا بنوالوں؟ ابھی سے؟''

'' نہیں ابھی اُس کی ضرورت نہیں بیٹی۔''

اداسی ایک بادل کی طرح ہا کے چہرے پر چھا گئی۔ خاموشی نے دونوں سہیلیوں کو حقیقت کے قریب کر دیا۔

'' اگر تم چوکی پر حملہ کروگی'' چن نے کہا،'' تو پھر میرے حصے کی گولیاں بھی تم ہی چلا دینا۔''

'' ہِنگا تنگ نہر عبور کر کے اپنے کامریڈوں کے ساتھ ایک مشترکہ حملہ کر دو۔''

ہا نے کچھ دیر کے لیے سوچا۔ جس چھڑی سے وہ خطرے کی گھنٹی بجاتی تھی اُس کے ساتھ اپنے گال رگڑتی رہی اور پھر فوری طور پر بولی،'' ہم سب لڑکیاں بالکل تنہا ہوں گی؟''

'' تم ہمارے مردوں کے ساتھ جا کر جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیتیں؟''

'' کیا خیال ہے، تم جشن کے خاتمے تک گھر میں کیوں نہ رہو؟''

اس پر پرانی یادیں پھر ذہن میں تیرنے لگیں۔ ایک مرتبہ ہا، چن کو ضلع کی منڈی میں لے گئی تھی تاکہ یہ دیکھا جائے کہ یہ امریکی مداخلت کار شکل وصورت کے کیسے ہوتے ہیں۔

چن گھر چلی گئی۔ اُس کی ماں کیک بنا رہی تھی اور بنہہ سو رہا تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر اُس نے اُن کا جائزہ لیا۔۔۔۔ اور اُس نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اماں کے بال ابھی سیاہ تھے لیکن اُس کی نظر اتنی کمزور تھی کہ اُسے مٹی کے تیل کے لیمپ کے اُوپر جھکنا پڑتا یہ دیکھنے کے لیے کہ آٹا گوندھا گیا تھا یا نہیں، اُسے آنکھیں میچنی پڑتی تھیں۔ چن نے اپنے آپ سے کہا:'' میں اماں اور چھوٹے بنہہ کو بہت جلد چھوڑ جاؤں گی۔''

'' تم اتنی دور جا رہی ہو کہ اگر تمھیں چھٹی ملی تو گھر کیسے آؤ گی؟'' اُس نے اپنی بیٹی

سے پُوچھا۔ ''سائیکل رکشا میں۔''

چن، نِگا اور ہا ایک دوسری کو تب سے جانتی تھیں جب وُہ ننھی ننھی بچیاں ہوا کرتی تھیں اور اُن کی چٹیا ہوتی تھی۔ ''جنگی نقطۂ نظر سے اہم گاؤں'' کی شمولیت سے وُہ بند ہو کر رہ گئی تھیں لیکن اُس کی زندگی مفلوج نہیں ہو سکتی تھی۔ اُن کی دوستی اور زیادہ مستحکم ہو گئی تھی۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وُہ بھینسے چرا رہی ہیں وہ کھیتوں میں چھپے سپاہیوں کو سامان دے آتیں۔ رات کے وقت وُہ چھوٹے سگنل لیمپ جلاتیں جو تاریکی میں ستاروں کی طرح ٹمٹماتے۔ یہ روشنی انقلابیوں کو گاؤں کا راستہ دکھاتی اور ''جنگی نقطۂ نظر سے اہم گاؤں'' کے قلب میں سینکڑوں ایسے ستارے چمکنے لگتے۔ عام طور پر دوپہر کے وقت چن ہاتھ میں پان پکڑے نِگا سے ملتی جو ایک درخت پر چڑھ جاتی اور اِسے جھنجھوڑ کر ہا کو پیغام بھیج دیتی۔ رنگین قمیضوں میں ملبوس یہ لڑکیاں ایک دوسری کو ملنے کے لیے کہیں اور چلی جاتیں۔ اِس گاؤں کے لوگ روزمرہ کے معمولات کے عادی ہو چکے تھے۔ وُہ اچھی خبر کے لیے اگلی صُبح کا انتظار کرتے۔ سپاہی، جو چیتے کی کھال کی جیکٹ پہنتا تھا، اپنے بستر میں مردہ پایا گیا یا کٹھ پتلی حکومت کا سیکرٹری، جو اپنی بھویں پنسل سے بناتا تھا، گاؤں کے باہر نوکدار بانسوں کے ساتھ بندھا ہوا پایا گیا یا سارے نوکدار بانس اور خاردار تار رات کو صاف کر دیے گئے۔ سردیوں کی راتوں میں ایک رومال لہراتے ہوئے چن کھیتوں میں پہرا دیا کرتی تھی اور وہاں شدید سردی اور مچھروں کی یلغار ہوا کرتی تھی۔ وُہ اپنی ڈیوٹی پر اُس وقت جاتی جب شام کا ستارا تاریک آسمان میں ایک لیمپ کی طرح جل اُٹھتا اور تب واپس آتی جب صُبح کا نیلا تارا آسمان سے غائب ہو جاتا اور طلوعِ آفتاب کی سُرخی نمودار ہو جاتی۔ اُنہی راتوں میں دوسرے گوریلوں کے ہمراہ نِگا اور ہا خاردار تار اُٹھا کر مزاحمتی اڈوں پر پہنچاتیں۔ صُبح سویرے واپسی پر وہ ایک دوسری کی جانب شرارت بھری نظروں سے دیکھتیں، ہنسنے لگتیں اور پھر ایک ۔۔۔۔۔ دو ۔۔۔۔ اور وُہ نہر میں کود جاتیں۔ وُہ نِچڑتی ہوئی دشمن کی چوکی کے قریب سے گزر جاتیں اور وُہ سمجھتے کہ شاید وہ مچھلیاں پکڑ کر آ رہی ہیں۔ ایک مرتبہ چن تین روز کے لیے باہر گئی اور تین دستی بموں کے ساتھ واپس آئی۔ ''خدا کے واسطے نِگا، یہ تو کسی لمحے بھی پھٹ سکتے ہیں۔'' ہا نے اپنے کانوں کو بند کر لیا۔ اپنے بال پیچھے کو جھٹکتے ہوئے چن نے دستی بم ایسے نکالے جیسے وُہ آلو ہوں اور پھر اپنی سہیلیوں کو پھندا لگانا سکھایا۔

پارٹی نے ابھی تک اِن تینوں لڑکیوں کی فوج میں بھرتی کے بارے میں درخواست

قبول نہیں کی تھی ۔ اِس لیے کہ اُن کی گاؤں میں شدید ضرورت تھی ۔

تب وہ دن آیا جب ''جنگی نقطۂ نظر سے اہم گاؤں'' کے گرد کی مورچہ بندی ختم کر دی گئی اور انفرادی دیہات نے اپنا تشخص حاصل کر لیا ۔ تینوں نوجوان لڑکیوں نے دوبارہ درخواست روانہ کی ۔ ہا کی تو یہ وجہ تھی کہ وہ جلد ہی سترہ کی ہو جائے گی اور پھر فوج میں بھرتی کے لیے اس کی عمر زیادہ ہو جائے گی ۔ نِگا نے کہا کہ اگر وہ گاؤں میں ٹھہری رہی تو وُہ اپنے دوست لڑکے با تگیے کے ساتھ اپنی شادی ملتوی نہیں کر سکے گی ۔ اور جہاں تک چن کا تعلق تھا اس کی واحد خواہش یہی تھی کہ وہ ملک کے کونے کونے میں جائے، رائفل ہاتھ میں پکڑے، محاذِ آزادی کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

محاذ آزادی کی فوج ٹانگ پھونگ چوکی کو تباہ کرنے کے لیے آ رہی تھی ۔ اُس شام چن کو بوڑھا ہائے نگا نگ ایسے ملا کہ اس کے ایک ہاتھ میں گٹار اور دوسرے میں نوکدار کیلوں کا ایک بنڈل تھا ۔ وُہ چیخ کر کہنے لگا: ''کہاں جا رہی ہو؟ کیا تم جانتی نہیں کہ ہمارا گاؤں اپنے دَستوں کے لیے ایک پُل تعمیر کر رہا ہے؟''

''چچا کیا وُہ سچ مچ آ رہے ہیں؟''

چن گاؤں کی طرف بھاگتی ہوئی گئی ۔ محاذِ آزادی کی فوج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شدتِ جذبات کے وہ ہر چند قدموں بعد ٹھوکریں کھا رہی تھی ۔ جو سڑک پنچایت گھر کی طرف جاتی تھی سپاہیوں، اسلحے اور توپوں سے بھری ہوئی تھی ۔ اُسے تو گزرنے میں بھی بے حد دِقت ہوئی ۔ اِس شور شرابے میں اُس نے چچا ہائے نگا نگ کی بھاری آواز سُنی جو سپاہیوں کو رات کے کھانے کے لیے بلا رہا تھا ۔ اُس کی ماں کچھ لڑکیوں کو چائے بنانے کے لیے کہہ رہی تھی ۔ اُس کی دادی آلتی پالتی مارے ایک سپاہی کے ساتھ گفتگو میں محو تھی جسے وہ دیکھ بھی نہیں سکتی تھی اور بچے خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے ۔ وہ آوازیں، جو گاؤں کی گلیوں کی طرح اُس کی جانی پہچانی تھیں، گونج رہی تھیں اور رات کو دن میں بدل رہی تھیں ۔

نِگا نے دوائی کا ایک برتن گرم کرنے کے لیے آگ پر رکھا ہی تھا کہ چن اور ہاَ آ گئیں ۔

''یہ تو ابھی تیار نہیں ۔ میں اِسے کیسے پی سکتی ہوں؟'' اُس نے آہ و زاری کی ۔

''بس اِسے نِگل لو ۔ ہم تمھاری مدد کریں گی ۔''

نِگا دوائی کو یک بارگی پی گئی اور اُسے محسوس ہوا اُس کے پیٹ کا درد فوراً غائب ہو گیا ہے۔ تینوں لڑکیاں جلدی سے باہر چلی گئیں۔ پھاٹک کے قریب پہنچنے پر اُنھوں نے ٹونگ پھونگ چوکی کی جانب سے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی رائفلوں کی گولیاں برسنے لگیں۔ وہ ابھی پناہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ منڈی کی طرف سے شور سنائی دیا۔ تونگ پھونگ چوکی پر قبضہ ہو گیا تھا۔ کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟ چن کے کانوں میں ابھی تک بہرا کر دینے والی آوازیں آ رہی تھیں۔ جن سپاہیوں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی وُہ ابھی تک گاؤں میں تھے چنانچہ یہ دوسرے تھے جنھوں نے حملہ کیا تھا۔ اتنا کچھ اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ چن خوشی کے مارے یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ جانا کہاں ہے اور کرنا کیا ہے۔

اگلے دن سپاہی وہیں ٹھہرے رہے تا کہ دشمن کو آنے والی کمک پر حملہ کیا جا سکے۔

گوریلا عورتیں رابطہ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں۔ دشمن کے گولوں کے ٹکڑوں نے درختوں کو پتوں سے محروم کر دیا تھا کیونکہ یہ اُن کے اُوپر گرے تھے۔ ہاکے گھٹنوں پر دشمن کے ہوائی جہاز سے چلے ہوئے چند کارتوس گرے۔ اِس سے پیشتر چن کا خیال تھا کہ انقلاب لانے کے لیے رائفل اُٹھا کر نکلنا، انقلاب دشمنوں کا خاتمہ کرنا، گاؤں والوں کے ہمراہ جلوس میں شریک ہونا، ایک ایسی موٹر بوٹ میں ضلعی منڈی جانا جس میں پوسٹر لگے ہوں، محاذِ آزادی کے سپاہیوں کو راک ڈاڈ چوکی کی طرف لے جانا تا کہ وُہ رات کو حملہ کر سکیں۔۔۔۔۔ بے حد ضروری ہے لیکن اس مرتبہ انقلاب ایک ایسے وسیع آسمان کی صورت میں سامنے آیا جس میں توپوں کی گھن گرج تھی۔ اُس نے انقلاب کے اِس نئے پہلو سے بہت جلد آشنائی حاصل کر لی۔ ایک امریکی جہاز آسمان پر ایک دھماکے سے پھٹ گیا اور دریا کے کنارے آ گرا۔ اُس کی حیرت صرف چند لمحوں کے لیے تھی۔ پھر اُس نے سوچا کہ یہ بالکل ٹھیک ہوا ہے کہ جہاں وہ بمباری کرتا تھا وہیں آن گرا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے وُہ اِس سے پہلے بھی کسی جہاز کو آسمان پر پھٹتے اور زمین پر گرتے دیکھ چکی ہے۔

دشمن کی پوری بٹالین میں سے صرف ایک ضلعی چیف بچا تھا جو ایک نیکر پہنے ہوئے تھا اور اُس کے ساتھ دو سپاہی تھے جو اِسی لباس میں تھے اور ضلعی صدر مقام کی طرف گرتے پڑتے بھاگے جا رہے تھے۔ نصف شب کے قریب، جب وہ سپاہیوں کو دریا پار کروا کر آ رہی تھی، چن کے پاؤں کسی نرم اور گیلی چیز پر پڑے۔ یہ ایک امریکی ہوا باز کی لاش تھی۔ جب وُہ راکٹوں اور

بموں سے مسلح زندہ تھا تو بھی وہ اُسے خوفزدہ نہیں کر سکا تھا اور اس وقت، جب کہ وہ گلے سڑے گوشت کا ایک پلپلا ڈھیر تھا، وُہ اس سے متاثر ہو گئی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ گاؤں والے لیمپ اُٹھائے گولوں کی پیٹیاں اور پیرا شوٹ اُٹھانے جا رہے تھے۔ جلتے ہوئے گنے کی تیز اور میٹھی خوشبو ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ چائے پی رہے تھے، بحث کر رہے تھے کہ بموں کے گڑھوں کو کیسے بھرا جائے، گھروں کو کیسے دوبارہ تعمیر کیا جائے اور سکول اور مارکیٹیں کیسے پھر سے بنائی جائیں۔ نِگا نے پُوچھا: ''کیا بچے منڈی والی جگہ میں سکول جائیں گے؟''

چن نے اپنی دوست کے لمبے بدن کو دشمن کے پیرا شوٹ گولوں کی روشنی میں دیکھا۔

''منڈی کل ہمارے سپاہیوں نے آزاد کروالی تھی۔'' اُس نے کہا'' کیا تمھیں علم نہیں ہے؟'' اس فاتحانہ جنگ نے تینوں لڑکیوں کو مختلف سطحوں پر چھوا تھا۔ نِگا نے سوچا: ''یہ کُچھ عجیب سا لگے گا کہ منڈی لے جا کر بچوں کو رقص کرنا اور گانا سکھایا جائے۔'' ہا اب دشمن کی بمباری سے خوفزدہ نہیں تھی لیکن وہ اب بھی ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی جہاز عین اُس کے سر پر نہ اگرے۔ اور جہاں تک چن کا تعلق ہے وہ اس دنیا میں ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے بلا وجہ غصے میں آ رہی تھی۔

گاؤں کی سرحد پر جو پتھریلی سڑک تھی، جس پر ''ڈان وے'' محافظ دھوپ کے چشمے لگائے اور سائیکل رکشاؤں میں بیٹھے گشت کیا کرتے تھے، اب ایک چھوٹے سے راستے میں بدل چکی تھی جس میں لوگوں نے سُوراخ اور خندقیں کھود رکھی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ منڈی کی طرف جانے اور وہاں سے آنے والی عورتیں چل رہی تھیں۔ ہر صبح ضلعی منڈی سے واپس آتے ہوئے بوڑھا ہائے نگا تنگ جدو جہد کرنے والے گاؤں کے ساتھ لگی خاردار تار کی قریب اپنی بائیسکل سے جھکتا اور اپنے ہاتھ پر پان کا کُچھ حصہ تھوک کر ایک اخبار لہراتے ہوئے کہتا: چن، تم کہاں ہو؟ ادھر آ کر سمندر اور خشکی پر چلنے والی لاریوں کی تصویر تو دیکھو۔''

عام طور پر جب یہ آشنا آواز سُنائی دیتی تو گاؤں والوں کو پتا چل جاتا کہ ایک نئی فتح نے جنم لیا ہے۔ وہ گھروں سے باہر نکل کر اُس کے چاروں طرف ایک دائرہ بنا لیتے۔

''عظیم فتوحات''، وُہ کہتا، ''ہم نے دشمن کی پُوری بٹالین لونگ آن میں نیست و نابود کر دی ہے۔ ایک بٹالین میں کتنے سپاہی ہوتے ہیں؟ تقریباً پانچ سو۔'' پھر وُہ درزی کی بیوی کے بارے میں باتیں کرنے لگتا جس نے لاج کی بیوی کی طرح بدنصیبی کو دُور رکھنے کے لیے اپنے

دروازے پر تعویذ باندھ رکھا تھا یا ان پچاس امریکی فینٹم طیاروں کے بارے میں جو بَن ہوا میں ہماری توپوں نے برباد کر دیے تھے۔ امریکہ کے سینکڑوں فوجی سائیگان میں ہلاک کر دیے گئے تھے، وُہ کہتا جاتا بَن گیا میں تو ہزاروں مارے گئے ہیں۔ ہمارے آباءواجداد کی سرزمین پر طوفان اُٹھ رہے تھے اور توپیں شعلے برسا رہی تھیں۔

اُن دنوں میں، جب ہر صبح فتوحات کی خبریں گونجتی تھیں اور ہائے نگا تنگ کی دو تاروں والی وائلن چاندنی راتوں میں سُنائی دیتی تھی، چن اور دوسرے گوریلے بہت کم اپنے گھروں میں ہوتے۔ درجنوں دیہات آزاد کرا لیے گئے تھے۔ اب بچے دن کی روشنی میں بھی یہ گا سکتے تھے:

''بدبو دار یانکی جونک۔'' نوکدار بانس کو تیز کرتے ہوئے چن اور اس کا گوریلا یونٹ دور دور تک دشمنوں کا پیچھا کرتا۔ اکثر اوقات اِس چھوٹے سے گاؤں میں فتوحات کی خبروں سے ہلچل مچ جاتی یا پھر محاذِ آزادی کے سپاہی گزرتے یا ہیلی کاپٹروں کا کوئی حملہ ہوتا اس کے فوراً بعد یہاں کے لوگ روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ کسی شے کی آمد کا انتظار کرتے ہوئے اور خواب دیکھتے ہوئے، کسی تالاب میں مچھلی کا یونگ ڈالتے ہوئے یا پھر ہائے نگا تنگ کی طرح اپنی جیب کا آخری سکہ بھی گوریلوں کے لیے رائفلیں خریدنے پر خرچ کر دیتے۔ اب زندگی میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بہت ہی قیمتی تھا اور ہر ایک اُسے بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا، یہاں تک کہ وُہ مرغ بھی بچایا جانا چاہیے تھا جسے دشمن نے زخمی کر دیا تھا۔

ایک صبح ہائے نگا تنگ کھانا کھا رہا تھا کہ چن آ گئی۔

''میں تمھیں خدا حافظ کہنے کے لیے آئی ہوں چچا۔ میں فوج میں جا رہی ہوں۔''

''تم اب جا رہی ہو؟'' ہائے نگا تنگ نے عینک اُتار دی۔

''تمھارے ساتھ بھی کوئی جا رہا ہے؟'' اُس نے دوبارہ پُوچھا۔

''بانگیب ۔۔۔۔۔ ٹام تُو ۔۔۔۔۔ محاذِ آزادی کے سارے جوان۔ نئے رنگروٹ ہماری جگہ لے لیں گے۔ اُن کی کمی نہیں ہے۔''

یک دم اِس پُرانے سپاہی کو محسوس ہوا جیسے دُور کہیں ایک توپ پھٹی ہے۔ وہاں چن بیٹھی تھی گول گول رخساروں، نوکدار ٹھوڑی اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ جو مُرغیوں کو دیکھ رہی تھیں۔

ہائے نگا تنگ نے اپنے وائلن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''شطرنج کے کھیل میں امریکی پھنس چکے ہیں، اس مرتبہ تم اُنھیں مات دے دو گے۔''

جشن کے تیسرے روز سڑک مختلف رنگوں کی سائیکلوں سے بھری ہوئی تھی۔ فتح کی نوید سناتے ہوئے پوسٹر ہر چوراہے پر ٹنگے ہوئے تھے۔ گاؤں کی سرحد پر واقع سڑک پر ریت اُڑتی تھی اور اس کے ساتھ باورچی خانوں سے لذیز خوشبو آتی تھی جہاں سفید قمیضوں میں ملبوس لڑکیاں کام میں مصروف تھیں۔ خندقوں کو پختہ کرلیا گیا تھا۔ زیرِ زمین سُرنگوں میں بچے گیت گاتے تھے۔ نِگا اور ہا، چن کے ساتھ سکول کے صحن تک گئیں جہاں گوریلے ایک شیر رقص کر رہے تھے۔ وہ اپنے کامریڈوں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

ہا نگیے حسبِ معمول اپنی گوریلوں والی وردی میں تھا: سیاہ پینٹ اور چُست جرابیں، ایک ایسی قمیض جس پر دو جیبوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بانس کا بنا ہوا ایک ہیٹ تھا جس میں پیراشوٹ کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ ہر کوئی اُس کی جانب دیکھتا، پھر نِگا کو دیکھتا اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

نِگا نے چن کا کندھا تھپکا اور کہا: ''جتنی جلدی ہو سکے خط لکھنا، ٹھیک ہے؟''

ماحول انتہائی خوشگوار تھا۔ ڈھول بج رہے تھے۔ بوڑھا ہائے نگا تگ نوجوان فوجی رنگروٹوں کو دیکھ کرانتہائی عقیدت سے بھرے لہجے میں کہنے لگا: ''فوج میں تم اس طرح نہیں لڑو گے جیسے یہاں لڑتے تھے۔ جب حملے کا حکم دیا جائے تو فوراً اس پر عمل کیا جائے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اس بار شطرنج کے کھیل میں ہمارے مُہرے اُن کے شاہ کو مات دینے والے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اوہ، تم ان نوجوانوں کو تو دیکھو۔ سب کے سب کتنے چاق و چوبند ہیں۔''

چن کے لبوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے رُک سیک کندھوں پر ڈالا ہوا تھا۔ پام کے پتوں سے بنے ہوئے ہیٹ کی ڈوری اُس کی ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔ سب کچھ اُس کے ذہن میں تھا۔ زمین کا وہ ٹکڑا، جو اُس کے خاندان کو ملا تھا، اب اُس پر تمباکو اور پھلیاں کاشت کی جائیں گی۔ اُس کی ماں میں ابھی اتنی سکت تھی کہ اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ چھوٹا بھائی اتنا بڑا تو ہو گیا تھا کہ اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھ سکے۔ نِگا اب عورتوں کے گوریلا گروپ کی سربراہ بن جائے گی۔ اگرچہ ہا اپنی خواہش کے مطابق ابھی فوج میں نہیں جا سکی تھی لیکن اُس کے پاس خاصا وقت تھا۔ مزاحمت ابھی تادیر جاری رہنی تھی۔ اُسے سب لوگ اور سب کچھ یاد تھا بوڑھا ہائے

نگا نگ، با کا دادا، کامریڈ ویٹ، گاؤں کے گوریلا یونٹ کا سربراہ اور پُرانی ایم۔اے۔ایس رائفل، وہ سڑک جس پر گوریلے چھاپے مارا کرتے تھے، وُہ نہر جس پر بار بار فضائی حملے ہوتے تھے اور گنے کے قطار اندر قطار کھیت جو''جنگی نقطۂ نظر سے اہم گاؤں'' کے آس پاس تھے۔اُسے ان سب کو چھوڑنے کا افسوس تھا۔یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ وہ آزادی کے سپاہیوں کے ہمراہ ملک کے کونے کونے میں جائے گی، وُہ اپنا پُورا گاؤں تو ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی!

اس کی ماں نے تھوڑا سا دھانی کیک اُس کے رُک سیک میں رکھ دیا اور ہائے نگا نگ سے کہنے لگی:

''ایک لڑکی کے طور پر اُسے اِس دنیا میں لانے پر ہمیشہ مجھے موردِالزام ٹھہراتی رہی۔ اب ذرا اس کی آنکھوں کو تو دیکھو! ہمیشہ کہتی تھی میری یہی خواہش ہے کہ میں فوج میں جا کر گاؤں کو آزاد کرواؤں۔اب جب کہ ہمیں آزادی مل گئی ہے تو یہ ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہی ہے؟''

وِچن نے اپنا ہیٹ فضا میں بُلند کرتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہا۔ڈھول بجنے لگے۔ نئے رنگروٹ مارچ کرنے لگے۔بوڑھے ہائے نگا نگ کو یوں محسوس ہوا جیسے بہت دُور توپیں دھاڑ رہی ہیں۔

میا ؤ سیو
(ملائشیا، سنگاپور)

واپسی

ابھی صبح کا ذب تھی ۔سلیٹی رنگ کا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی پھوار شروع ہوگئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔گاڑی چلنے والی تھی ۔ اس پر بہت کم مسافر سوار تھے اور انھیں الوداع کہنے کے لیے آنے والے ان سے بھی کم تھے ۔ جونہی بارش شروع ہوئی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے چند لوگوں میں کچھ ہل جُل ہوئی لیکن چنگ زے نے ان کی طرف دھیان نہ دیا اور اپنی چھوٹی سی نوکدار ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے، چہرہ اوپر کیے اپنی نشت پر تقریباً بے حس وحرکت بیٹھی بغیر کسی مقصد کے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی ۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا پوڈر لگا ہوا تھا اور اس کے بال جو ابھی کچھ دیر پہلے بنائے گئے تھے، اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے ۔ اس کی آنکھیں اس کے چھوٹے ، پتلے اور بیضوی چہرے کی مناسبت سے بہت بڑی لگ رہی تھیں ۔ وہ سلیٹی رنگ کے آسمان کی طرف کچھ کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی ۔

وہ اپنے آپ میں گم یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے گردن اُٹھا کر یہ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا کہ اس کے آگے سے کون گزر رہا ہے یا اس کے برابر میں کون بیٹھا ہے ۔ جب بارش اس کے چہرے اور ہاتھوں کو بھگونے لگی اور اسے خنکی کا احساس ہوا تو اس نے جانا کہ موسم بدل چکا ہے اور کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھ گئی ۔ اس نے اپنا چھوٹا سوٹ کیس کھولا اور اس میں نیلے رنگ کا ایک ہلکا اونی

سویٹر نکال کر کندھوں پر ڈال لیا۔

بارش تیز ہو چکی تھی۔صبح کاذب کی سیاہی میں ریل کی پٹریاں ایک سرد چمک لیے ہوئے تھیں۔انجن میں سے نکلتی ہوئی کوئلے کی باریک راکھ صبح کی نمی آلود ہوا کے ساتھ مل کر سارے سٹیشن پر ایک بے جان دھند کی طرح پھیل رہی تھی۔

لوہے کے بڑے پھاٹکوں سے باہر بارش کے قطروں کے پردے کے پیچھے نوآبادیاتی شہر کی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں جو غیر مستحکم اور نیچی چھت والے ''اناپ'' جھونپڑوں پر دیووں کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ایک جانا پہچانا منظر جو انسان ہمیشہ دیکھتا تو ہے لیکن خالی نظروں سے ،غور کیے بغیر۔

ہاں یہ ایک جانا پہچانا منظر تھا۔وہ اس شہر کے بارے میں تقریباً سب کچھ جانتی تھی۔ اس کے ساتھ دوستی کیے بغیر اس نے یہاں پورے دس برس گزارے تھے۔اس شہر کی یادیں جو اس کے ذہن پر ثبت تھیں ،آسانی سے مٹائی نہیں جا سکتی تھیں۔

دس برس ۔۔۔۔۔۔بہت بڑا عرصہ بھی نہیں ہوتا۔جب اس نے شہر میں رہائش اختیار کرنے کے لیے گاؤں چھوڑا تھا تو وہ ابھی ایک نوجوان لڑکی تھی۔زندگی سے بھرپور اور بے خوف۔اور اب وہ اٹھائیس برس کی تھی۔اس جیسی عورت کے لیے اٹھائیس برس کی عمر خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے اور اسے اپنے مستقبل کے بارے میں بہرصورت غور کرنا پڑتا ہے۔لیکن جب بھی وہ انیس سالہ لڑکے کے ساتھ ہوتی مستقبل کے بارے میں سوچنا اتنا ہی پریشان کرنا جتنا ایک لاعلاج بیماری کرتی ہے۔جب اس کے نوجوان اور گٹھے ہوئے بدن نے اسے چھوا تھا تو اسے یوں لگا تھا جیسے وہ بہت تیز شراب پی رہی ہے۔۔۔۔۔تب اس نے محسوس کیا کہ وہ جسمانی اور جذباتی طور پر خالی ہو چکی ہے۔اسے لمس کا وہ لمحہ پسند آیا تھا جب اس لڑکے نے اس میں زندگی کی قوت انڈیل دی تھی اور نوجوانی کا وہ جذبہ جسے وہ کھو چکی تھی مگر دوبارہ پانا چاہتی تھی۔

شاید مسرت اسی کا نام تھا۔اُس نے اس پر یقین کر لینے کی پوری کوشش کی۔اس مسرت کو گرفت میں لینے، اس سے لطف اندوز ہونے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے کی اور پھر کھونہ دینے کی پوری پوری کوشش کی مگر وہ بری طرح ناکام رہی۔

ایک تیز سیٹی کی آواز آئی۔گاڑی نے حرکت کی اور پُرشور انداز میں پٹریوں پر چلنے لگی۔شہر ایک سلیٹی رنگ کی چادر میں لپٹا پیچھے رہ گیا تھا اور جوں جوں فاصلہ بڑھتا گیا توں توں

جانے پہچانے مقامات دور ہوتے گئے اور بالآخر گاڑی نے ایک پہاڑی کے گرد چکر کاٹا تو شہر سرخ رنگ کی ایک چٹان کے عقب میں روپوش ہو گیا۔

اس نے شہر پر ایک چھلکتی ہوئی آخری نظر ڈالی جس میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔ اسے یہ شہر چھوڑنے کا کوئی دکھ نہ تھا۔ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا کوئی پچھتاوا بھی نہ تھا لیکن رخصتی کے لمحے نے اسے اپنی آمد کی یاد دلا دی۔ وہ دس برس پیشتر موسم بہار میں یہاں آئی تھی۔ جنگ ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ وہ اس زمانے کے نوجوان طبقے کی طرح اپنے سامنے ایک روشن مستقبل دیکھتی تھی اور نوجوانی کے گرم اور اُبلتے ہوئے خون کے ساتھ زندگی کے تیز بہاؤ میں کود پڑنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ شہر آ گئی، پُر امید اور پُر شوق۔ چونکہ وہ کچھ کر گزرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے بڑی قربانیاں دینے میں ذرا برابر تأمل نہ کیا اور ان میں اس کا پرائمری سکول ماسٹر منگیتر بھی شامل تھا اور اس کا قدامت پسند خاندان بھی صرف اس لیے کہ وہ شہر کی رونقوں اور روشنیوں میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ تو دس برس پہلے کا قصہ تھا جب اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا تھا کہ وہ ناکام ہو جائے گی اور اسے واپس جانا پڑے گا۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل، زخمی روح اور جسمانی تھکاوٹ کے ساتھ۔

اس نے ایک بے اختیار آہ بھری اور فیصلہ کیا کہ وہ اس کے بارے میں سوچنا ترک کر دے گی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ماضی کی یادیں اُس شہر کی بارش میں دُھل جاتیں جو وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ لیکن ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ ماضی بڑی بے رحمی سے اُس کے ساتھ چمٹا ہوا تھا اور کڑوی کسیلی یادیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

کل شام وہ ایک مرتبہ پھر شہر کے اُس سیاہ حصے میں گھومنے نکلی تھی۔ وہ حصہ پُر ہجوم سے خاصا دور تھا۔ ایک طویل سڑک، بائیں ہاتھ پر ایک پہاڑی اور دائیں جانب ایک گندا دریا بہتا تھا۔ اداس شاموں میں وہ یہاں چہل قدمی کے لیے آ جایا کرتی تھی۔ پچھلے تین ماہ کے دوران نہ جانے وہ کتنی مرتبہ ادھر آئی تھی۔ پہاڑی کے نیچے جو دو منزلہ دوکانوں کی عمارتیں تھیں انھیں دیکھتے رہنے کی اسے عادت ہو گئی تھی اور وہ دکانیں بے حد خستہ حالت میں تھیں۔ اسے دوکانداروں کے چہرے دیکھنے کی بھی عادت ہو گئی تھی۔ دریا کے کنارے پتھریلی سیڑھیوں کے نزدیک کھڑی چھوٹی کشتیوں اور گندے سیاہ اور غلیظ پانی سے اٹھتی ہوئی بدبو۔۔۔۔۔۔

وہ اس رات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی جب وہ چپکے سے اس کافی بار سے نکلی تھی جو

کشتی کے کھڑا ہونے کی جگہ کے نزدیک واقع تھی اور وہ اُس انیس سالہ لڑکے کے بازو کا سہارا لیے ہوئے تھی جس کے کندھے بہت چوڑے تھے۔ وہ اس تاریک راستے پر چل رہے تھے جو دریا کے ساتھ نیچے جا رہا تھا۔ آسمان پر ایک ایسا پورا چاند چمک رہا تھا جیسا صرف استوائی خطوں میں نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی چمکتی ہوئی کرنوں کا لبادہ دریا کی دائمی گندگی پر ڈال دیا تھا جس میں ادھر ادھر مردہ جانوروں کے بدبودار ڈھانچے تیر رہے تھے۔ گائیں، جنھیں گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی لاپرواہی سے ڈکرا رہی تھیں اور اس سیاہ جھاڑی کی جانب جا رہی تھیں جو پہاڑی پر واقع گھروں کے پیچھے تھی لیکن اس سے ہر شے میں ایک جذباتی آمیزش تھی، خاص معانی تھے اور اس کا سر یوں چکرا رہا تھا جیسے اس نے تیز شراب پی رکھی ہو۔

اُس راستے کے آخر میں تنگ پل کے پار، تفریحی پارک میں نیون روشنیاں چمکتی تھیں اور ان کی روشنی میں آسمان کا نصف حصہ ایک آتشی لَو دیتا تھا۔ وہ اس کے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی، باتیں کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے جیسا کہ نوجوان کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس پارک میں واقع ''زیرِ زمین جنت'' کی سرنگ کی بھی سیر کی تھی۔ اس تاریکی میں یہ سیر بے حد پر لطف تھی۔ اس دوران میں جب کبھی کوئی بلا میں تلوار پکڑے اندھیرے میں سے نمودار ہو جاتی تو وہ اس سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اسے ایک مزاحیہ شے سمجھتی۔ اس نے اپنی گردن پر اپنے ساتھی کے نوجوان داڑھی کی چبھن محسوس کی تو اس نے اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے حوالے کر دیا کہ بے شک وہ اسے جتنا چاہے زور سے بھینچ لے۔ اس وقت اس کا خیال تھا اس کی ویران زندگی میں شاید ابھی خوشی آنے کی امید ہے۔

گاڑی ساحل کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سمندر کا رنگ سیاہی مائل سبز تھا اور کہیں کہیں بادامی رنگ کا کوئی مال گودام یا درختوں کا کوئی جھنڈ نظر آ جاتا تھا۔

یہاں سے سمندر پر تیرتی جھاگ نظر آ رہی تھی اور کچھ فاصلے پر چند کشتیاں جو بارش کی وجہ سے نامعلوم ہیولوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

اُسے سمندر سے اور سمندری جہازوں سے نفرت تھی۔ وہ سمندری جہاز اور سمندر ہی تھا جو اس خوشی کو بہا لے گیا تھا جس کی اس نے امید کی تھی۔

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا یہ دریا پکنے کے موسم میں ہوا تھا۔ اس پھل کی عجیب وغریب مہک سے، جو نو واردوں کو پسند نہیں آتی تھی لیکن مقامی لوگوں کے منہ میں پانی بھر لاتی تھی، ساری

فضا میں رچی ہوئی تھی اور تب اس نے محسوس کیا کہ اس کے اور اس کے انیس سالہ نوجوان دوست کے تعلقات پر ایک سیاہ سایہ پڑ رہا ہے۔

وہ نوجوان جو اب تک بے حد خوش وخرم تھا چپ رہنے لگا تھا۔ وہ حسب معمول ایک دوسرے میں گم ہو کر ایک دوسرے کو چومتے لیکن وہ وہاں نہ ہوتا تھا۔ بس خالی فضا کو گھورتا رہتا۔ اس کے چوڑے ماتھے پر جو عام طور پر بے فکر اور ہموار ہوتا تھا۔ اب تفکر کی لکیریں ابھر رہی تھیں۔

''اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔'' وہ بے چینی سے سوچتی۔

لیکن وہ اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ صرف تیوری چڑھاتا اور بس۔ بالآخر وہ اس بوجھ کو نہ سہار سکا جو اس کے ذہن پر تھا۔ ''میں اس جگہ کو چھوڑ دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میں تمھیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔''

''تم یہاں سے چلے جانا چاہتے ہو؟ تمھارے ذہن میں یہ خیال آیا کیسے؟'' وہ اس کے بازوؤں سے الگ ہو کر بولی۔ ''کیا تم یہاں خوش نہیں ہو؟''

''نہیں میرا اس ملک سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ تمھارے لیے اچھا ہے لیکن میرے لیے نہیں۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ اس زمین میں میری جڑیں نہیں ہیں۔ میں کب تک اپنے آپ کو یہاں گھسیٹتا رہوں؟ یہاں کی زندگی مجھے تباہ کر رہی ہے۔''

''اگر تم یہی چاہتے ہو تو ٹھیک ہے میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ تم جانتے ہو کہ میں تمھارے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔

''تمھیں مجھ پر یقین نہیں ہے ڈارلنگ؟'' وہ اسے بازوؤں سے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

اس نے نظریں جھکا لیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ یکدم اس کے ذہن میں روشنی کا ایک کوندا لپکا اور وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ اٹھائیس کی تھی اور وہ صرف انیس برس کا۔ ان کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل تھی۔ وہ کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔

''ہاں، میں سمجھتی ہوں۔ تم جاؤ، چلے جاؤ، میں تمھیں نہیں روکوں گی'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور اپنے جذبات چھپانے کے لیے اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور رونے لگی۔

وہ اسے دو دن تک ملنے نہیں آیا اور پھر ڈاکیہ اس کا ایک خط لے کر آ گیا۔ اس نے لرزتی انگلیوں کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔

ڈارلنگ!

مجھے افسوس ہے لیکن نہ جانا میرے بس میں نہ تھا۔ جب تم یہ خط پڑھو گی تو ہمارے درمیان سمندر حائل ہو چکا ہوگا۔ ہر شے کے بارے میں بھول جاؤ اور۔۔۔۔۔۔ اس نے خط کو ایک جانب رکھ دیا کیونکہ وہ اسے آخر تک نہ پڑھ سکتی تھی۔

کنڈکٹر نے ڈبے کا دروازہ کھولا تو راہداری سے یخ ہوا شرائے بھرتی ہوئی اندر آ گئی۔ سردی کی وجہ سے وہ اپنے خواب سے بیدار ہو گئی اور اس نے کسی ٹھنڈی شے کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے ہاتھ اوپر کر کے دیکھا تو اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے کن اکھیوں سے اپنے ہم سفروں کی جانب دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہ یا تو سو رہے تھے یا مطالعے میں مشغول تھے۔ جو لوگ اپنے بچوں کے ہمراہ سفر کر رہے تھے وہ ان کے ساتھ کھیل رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بھی اس کی موجودگی کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

گاڑی ایک چھوٹے سٹیشن میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ یہ ایک قصباتی سٹیشن تھا۔ بہت پرانا اور چھوٹا سا۔ خستہ حال۔ ٹائلوں والی چھتوں کی ایک قطار کے ساتھ۔ اس نے اس مقام کو فوراً پہچان لیا۔ دس برس پیشتر وہ شہر جانے کے لیے یہاں سے گزری تھی۔ وہ اس زمانے کی نسبت کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوا تھا لیکن ابر آلود آسمان کی وجہ سے اس پر اداسی چھائی ہوئی لگتی تھی۔

بارش ابھی تک برس رہی تھی۔ سٹیشن ویران پڑا تھا۔ بہت کم مسافروں نے وہاں سے گاڑی پکڑی یا وہاں اترے۔ ایک بارہ تیرہ سالہ'' کامپانگ'' لڑکا نمک لگے انڈوں کی ٹوکری اُٹھائے اس کے پاس آیا۔ وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے بھیک مانگ رہا ہو۔

دس برس پیشتر جب وہ یہاں سے گزری تھی تو بالکل اسی قسم کا ایک لڑکا نمک لگے انڈے فروخت کرنے کے لیے اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا، کچھ پیسے نکالے اور ایک انڈا خرید لیا۔ اس لیے نہیں کہ اسے اس کی ضرورت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو یاد دلانا چاہتی تھی کہ دس برس پہلے اس نے اسی سٹیشن سے ایک ایسا ہی انڈا خریدا تھا۔

اس کا اپنا قصبہ اب کیسا لگتا ہوگا؟ وہ کچھ زیادہ تو نہیں بدلا تھا لیکن اس کی خالہ کے

ایک خط کے مطابق وہ بہت جدید ہو چکا تھا اور کافی ترقی کر چکا تھا کیوں کہ وہاں برطانوی فوجیوں کا ایک دستہ تعینات تھا۔ زمین کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ اس کی خالہ نے بتایا تھا کچھ لوگ زمین کے اس ٹکڑے کی بہت اچھی قیمت لگا رہے تھے جس پر اس کا باپ سبزیاں اگایا کرتا تھا۔ وہ گزشتہ برس جنوری کے مہینے میں فوت ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے دوست لڑکے کے ہمراہ تھی جب اسے وہ خط موصول ہوا تھا اور چونکہ اس کا گاؤں واپس جانے کا کوئی ارادہ ہی نہ تھا اس لیے اس نے اپنے باپ کی وفات کے بارے میں کچھ زیادہ پروانہ کی تھی۔ اور اب ایک شکستہ دل لیے وہ واپس جا رہی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اس شہر میں رک نہیں سکتی تھی جس نے اسے بے انتہا مسرت دی تھی اور پھر اتنا ہی دکھ بھی دیا تھا۔ اور دوسری وجہ، وہ مانے چاہے نہ مانے، یہ تھی کہ وہ ایک پرانے جاننے والے سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خالہ نے اپنے آخری خط میں اس آدمی کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ وہ سکول ماسٹر، جو اس سے ملاقاتیں کیا کرتا تھا، اب اپنی بیوی سے الگ ہو چکا تھا۔ ''وہ انتہائی خوفناک قسم کی عورت ہے''۔ اس کے خالہ نے لکھا تھا۔ بظاہر یہ ایک عام سی بات جو اس کی خالہ نے یونہی لکھ دی تھی، اداس یادوں کے ایک سیلاب کا سبب بن گئی تھی اور اپنے تازہ زخم چاٹتے ہوئے ان یادوں نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ اس کو اس کا لمبوترا بیضوی چہرہ اور اداس روشن آنکھیں یاد آئیں جن سے آنسو آسانی سے بہہ نکلتے تھے۔ ہاں وہ بے حد جذباتی تھا اور بالغ نہیں ہوا تھا جیسا کہ ایک مرد کو ہونا چاہیے۔ وہ اتنی آسانی سے آب دیدہ ہو جاتا تھا کہ کئی مرتبہ وہ اس کے سامنے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ وہ اس پر ترس کھایا کرتی تھی۔ لیکن ترس کھانا محبت کرنے کے مترادف نہیں اور بالآخر اس نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کو بھی۔۔۔۔ شاندار مستقبل کے لیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شکل۔ اس کے پہلے پیار کی شکل۔ مدھم پڑنے لگی اور پھر یادوں کے انبار تلے دب گئی۔

یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ خالہ کی خط و کتابت سے اس نے اپنے محبوب سکول ماسٹر کے بارے میں کچھ جان لیا تھا۔ اس کا اولین محبوب اور اسے اس کی دکھی شکل یاد آئی تھی جس نے اس کے ذہن میں کئی چیزوں کو چھیڑ دیا تھا۔ بہت ہی مدھم اور دیرینہ یادیں روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔

گاڑی اس کے قصبے کے نزدیک ہو رہی تھی۔ جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی

اس کے دل میں اپنی واپسی کے بارے میں اتنے ہی زیادہ شکوک سر اٹھا رہے تھے۔ اس کی واپسی کی اصل وجہ کیا تھی؟ وہ کس لیے واپس جارہی تھی اس پر اُسے شرم بھی آئی لیکن وہ امید پرست تھی۔''زندگی دوبارہ شروع کرنے کا میرے پاس ابھی ایک موقع اور ہے''اس نے سوچا۔

یہ امید دورانِ سفر قائم رہی لیکن جب گاڑی لکڑی سے بنے ہوئے سٹیشن پر رُک گئی تو وہ ذہنی طور پر کچھ بکھری گئی۔ یہ خوشی تھی؟ یا خوشی بھی اور ناخوشی بھی؟ ۔۔۔۔۔ وہ فیصلہ نہ کرسکی۔

ہینڈ بیگ میں سے نکالے ہوئے آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے بال درست کی اور پھر اپنا سوٹ کیس اٹھا کر راہداری میں آئی اور مسافروں میں مل گئی۔

چھوٹا سا لکڑی سے بنا ہوا اسٹیشن ویسا ہی تھا جیسا کہ دس برس پیشتر تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا، یہاں تک کہ وہی ہندوستانی اب بھی سٹیشن ماسٹر تھا۔ اس میں بھی صرف یہ تبدیلی آئی تھی کہ اب اس کے بال سفید ہور ہے تھے۔ پلیٹ فارم سے پرے بے شمار رکشے سواریوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ انھیں چلانے والے ملائی تھے۔ ان میں سے ایک خوشی سے دمکتا ہوا بادامی چہرہ اس کے پاس بھی آیا لیکن اس نے اپنی جنم بھومی پر پیدل چلنا زیادہ بہتر جانا۔

سٹیشن سے باہر نکلتے ہی وہ مرکزی سڑک کی طرف جانے کی بجائے اُدھر چلنے لگی جہاں سے کھیت شروع ہوتے تھے۔ سفید گنبدوں والی ایک مسجد کے قریب سے گزرنے کے بعد وہ ناریل کے ایک چھوٹے سے باغ میں داخل ہوگئی۔ پھر ایک زرد لہروں والا دریا آیا جو پہاڑوں سے نیچے آرہا تھا۔

ناریل کے باغ سے باہر آتے ہی اسے سامنے وہ جگہ نظر آگئی۔ وہ حیرت زدہ ہوکر رُک گئی۔ یہ تو کسی کی بھی ملکیت نہیں تھی اور یہاں دریا کے دونوں طرف جنگلی گھاس پھونس اور سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے سکول ماسٹر کو یہیں ملا کرتی تھی۔ یہیں پر ان کے لب اور جسم ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے لیکن سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس جگہ دریا کے کنارے اب ایک مارکیٹ تعمیر ہو چکی تھی جہاں پکے مکان اور دوکانیں تھیں۔

وہ جذباتی طور پر بہت دکھی ہوئی اور اسے اپنے اندر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ وہ دریا کے ریتلے کنارے پر قدم دھرتی جارہی تھی۔ وہی ریت جس پر خدا جانے وہ کتنی بار چل چکی تھی۔ ہاں یہیں پر اس کا بچپن تھا، اس کی جوانی اور خوشی کے لمحے اور اس کا پہلا محبوب۔ یہیں پر، ریت کے ہر ذرے میں۔

دوپہر کا سورج دریا کے عین اوپر چمک رہا تھا۔ وہ وہیں رک گئی اور خراماں خراماں بہنے والے دریا کو دیکھتے ہوئے اپنی نوخیزی کے زمانے کی یادیں تازہ کرنے لگی۔ وہ یہاں انڈوں کی شکل کے چھوٹے پتھر تلاش کرنے آیا کرتی تھی۔ یہ دس برس پہلے کی بات ہے۔ جس شام سکول ماسٹر کو معلوم ہوا کہ اس نے گاؤں چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا دریا کے کنارے تقریباً بیہوش ہو کر گرنے کو تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا اس کے ساتھ ایسا سلوک ظالمانہ نہیں تھا؟

''کیا وہ اب بھی مجھ سے نفرت کرتا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔ ہوسکتا ہے اب بھی وہ مجھ سے اتنی محبت نہ کر سکے جتنی کیا کرتا تھا۔

وہ وہیں رک جانا چاہتی تھی۔ وہ وہاں سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ آگ اگلتا سورج اس کی گردن کی نازک جلد کو جلا رہا تھا۔

وہاں سے وہ مرکزی سڑک کی طرف لوٹ آئی لیکن اپنے گھر کی جانب چلنے کی بجائے وہ چینی مندر کی طرف مڑ گئی۔ وہاں وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ پرانی عمارت میں مختلف سائزوں کی ناموں کی تختیاں اب بھی لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اندر خاموشی تھی۔ وہاں ایک بھی بچہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تو کیا کلاس کا وقت ختم ہو چکا ہے؟ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف سوا بارہ بجے تھے اور وہ جانتی تھی کہ دوپہر کے وقت بھی ایک کلاس لگتی ہے۔ کہیں سکول ہمیشہ کے لیے تو بند نہیں ہو گیا!

پرائمری سکول کے سامنے ڈراموں کے لیے ایک سٹیج بنی ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے بچپن کے دنوں میں یہ مندر خاصا مالدار تھا اور تہواروں کے موقعے پر سال میں کم از کم دو بار یہاں خوب جشن منایا جاتا تھا اور ہر بار سنگاپور سے ڈراما دکھانے والے آیا کرتے تھے جو اوپن ائیر میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ سارے قصبے کے لیے یہ ایک میلہ ہوا کرتا تھا اور وہ ضد کر کے اپنی خالہ کے ہمراہ یہاں آیا کرتی تھی۔ اب وہاں کوئی سٹیج نہ تھی اور اس کی جگہ ایک دو منزلہ دکان نے لے لی تھی۔ پرائمری سکول کے عین سامنے ایک کافی بار تھی۔ وہ بہت تھک چکی تھی اور اسے پیاس لگ رہی تھی چنانچہ وہ بار کے اندر چلی گئی اور ایک بغیر کریم کی کافی کا آرڈر دے دیا۔ ایک بوڑھا بیرا خاموشی سے سر جھکائے آیا اور کافی کا ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''آج کیا دن ہے؟ سکول کیوں نہیں کھلا؟'' اس نے بیرے سے دریافت کیا۔

''دراصل آج سکول بند ہے۔سکول ماسٹر مر گیا ہے ناں،تو ساری بچے اس کے جنازے پر گئے ہوئے ہیں۔

''کیا؟کونسا سکول ماسٹر مر گیا ہے؟''اس نے کافی کا پیالہ رکھتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

''کونسا؟۔۔۔۔۔یہاں تو صرف ایک ہی سکول ماسٹر تھا،مسٹر چانگ۔۔۔۔۔بہت ہی شاندار شخص تھا لیکن جوانی میں ہی مر۔یہ بے حد افسوس ناک بات ہے لیکن زندگی تو یہی ہے۔کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا وہ بیمار تھا''

''بہت عرصے سے اس کے پھیپھڑوں میں کوئی خرابی چلی آ رہی تھی۔''بوڑھے بیرے نے سر ہلاتے ہوئے کہا''لیکن بدترین بات تو یہ تھی کہ حال ہی میں اس کی بیوی نے طلاق لے لی تھی۔بس اسی بات نے اسے مار ڈالا۔ذرا کھڑکی سے باہر دیکھو۔جنازہ اسی طرف آ رہا ہے۔''

اس نے اس جانب دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔وہاں ایک بلا چھت کی لاری آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی جس میں ایک تنگ سفید تابوت رکھا ہوا تھا،اس کے پیچھے درمیانی عمر کے کچھ مرد پیدل آ رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں چکنے کاغذ کی چھتریاں تھیں۔ان کے ساتھ سفید قمیض اور نیلی نیکریں پہنے سکول کے بچے تھے۔

وہ کھڑی ہو گئی۔اس کا سر چکرا رہا تھا۔اسے دور سے بوڑھے بیرے کی سرگوشی سنائی دی۔''وہ عورت اتنی سنگدل ہے کہ جنازے پر بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔۔۔''

اس نے کافی کی قیمت ادا کی،اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور سکول کے بچوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ابھی تک اس کا سر چکرا رہا تھا۔اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو گئی۔اسے محسوس ہوا کہ اس میں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں رہی۔کچھ دور تک وہ جنازے کے پیچھے پیچھے چلتی رہی لیکن پھر وہ یک دم رک گئی کیوں کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایسی آنکھوں کا مرکز بنتی جا رہی ہے جن میں بے شمار سوال تھے۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے وہاں خاموش اور بے حرکت کھڑی رہی پھر یک دم اس نے منہ موڑا اور تیزی سے سٹیشن کی جانب چلنے لگی۔

ژانگ جی
(چین)

کیسے بتائیں جیون!

1176 نمبر کی بس پر ایک نئی کنڈکٹر تھی۔ ایک دُبلی اور نازک سی لڑکی جو آسانی سے ٹوٹ جانے والے کانچ کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ بڑی آسانی سے اُس پر ''احتیاط سے ہاتھ لگایئے'' کا لیبل لگایا جا سکتا تھا۔ ہر مرتبہ جب وہ ہجوم میں سے نکلتی دھکیلتی راستہ بناتی، شی یانان کو یہی فکر ستاتی کہ وہ ٹوٹ جائے گی اور اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس وو ہوان یہ سوچتا کہ آخر ایک اور ٹکٹ بیچ کر وہ کیا کرلے گی؟ چند ٹکے بس کمپنی کو بنا سکتے ہیں نہ برباد کر سکتے ہیں۔ وہ ٹکٹ فروخت کرنے کے معاملے میں اتنا تردد کیوں کرتی ہے؟

اُس کے ہونٹ قدرے اُوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور لگتا تھا وہ ہمیشہ مسکراتی رہتی، ہے۔ اُس کی گہری اور اثر انگیز آنکھیں، جو اُس کے دُبلے اور زرد چہرے پر تھیں، اپنے سامنے کھڑے شخص یا شے پر کبھی نہ ہوتیں۔ اس کی بجائے وہ ادھر اُدھر بھٹکتی رہتیں۔ کبھی یہاں کبھی کہیں دُور اور لوگ یہ تاثر لیتے کہ وہ گہری سوچ میں غرق ہے یا خواب میں گُم ہے۔

لیکن جب وہ گہری سوچ والی خوابیدہ سی آنکھیں آپ پر مرکوز ہوتیں اور وہ بڑی نرمی سے پوچھتی: آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ کو ٹکٹ چاہیے تو لامحالہ آپ کو وہ آداب یاد آ جاتے جو کسی زمانے میں سکھائے جاتے تھے اور اب اُن کا سُراغ تک نہیں ملتا۔ بارش ہو رہی ہو یا دھوپ چمک رہی ہو، وہ اپنا کام پُوری لگن سے کرتی تھی: ٹکٹ فروخت کرتے ہوئے یا بس سے باہر کھڑے ہو کر اپنے نازک بازوؤں سے مسافروں کو اندر آنے میں مدد دیتے ہوئے

لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کی جسمانی قوت اُس سخت کام کے لیے ناکافی ہے۔
آغازِ بہاراں میں، جب ابھی روئی دار کوٹ پہنے جاتے ہیں، اُس کی پیاری سی ناک پر پسینے کے قطرے چمکتے۔ اُس کے بال باغی ہو کر اُس کے کلپ سے باہر نکل آتے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اس طرح لہراتے کہ اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ چونکہ مسافر تمام کے تمام اجنبی ہوتے تھے اس لیے چپکے بیٹھے رہتے ورنہ کوئی نہ کوئی شخص اُس کی آوارہ لٹ کو ضرور سلجھا دیتا۔

نوجوان لڑکے اس کی موجودگی میں بے چینی محسوس کرتے۔ صرف ووہوان پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ فقرے بازی کرتا رہتا۔ مثلاً پچھلے دروازے سے چڑھ آنے والے ایک لڑکے کے بارے میں اُس نے کہا کہ ذرا اِس لفنگے کو دیکھو، اِس نے اپنا سوٹ کمیشن شاپ سے لیا ہے۔

اُس کے دوستوں کا خیال تھا یہ بہت پُر لطف بات ہے۔ اس کے علاوہ وہ ووہوان کے شکرگزار بھی ہوتے کہ اُس نے اُنھیں اس بے چینی سے نجات دلا دی تھی، چاہے عارضی طور پر ہی سہی۔

شی یانان نے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس نے ووہوان کا کہا ہوا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا اور وہ ٹکٹ اور ریزگاری واپس کرنے میں مشغول تھی۔ اُس نے نائلون کے دستانے خاصے استعمال شدہ تھے۔ سلائی میں ایک سُوراخ بھی تھا جس میں سے ایک نازک انگوٹھا اور انگلی نظر آتے تھے۔

اگر شی یانان دائیں جانب دیکھتا تو ووہوان بھی اُسے چوری چھپے دیکھ سکتا تھا۔ فیکٹری میں کام کرنے والے نوجوان مزدوروں کا اپنا ایک ''گروہ'' تھا۔ زندگی کے قدرتی بہاؤ کے نتیجے میں ایسے گروہ آپ ہی آپ بن جاتے ہیں۔ شی یانان کا گروہ لفنگوں کا گروہ تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹیاں بجانا معیوب سمجھتے تھے۔ انھیں چھیڑنا اور آوازیں کسنا اُن کے نزدیک بُری بات تھی۔ شی یانان اور اُس کا گروہ واہیات قسم کے کپڑے پہن کر بھی نہیں گھومتے تھے۔ وہ بدمعاشوں کی نسبت زیادہ تہذیب یافتہ واقع ہوئے تھے۔

ووہوان کی طرح کتنے لوگ ہوں گے جو سپنوزا کی کتاب لیے پھرتے ہوں؟ یہ بھی نہیں کہ ہر کسی کو یقینی طور پر علم ہو کہ وہ یہ کتاب کیوں پڑھ رہا ہے۔ دراصل اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کتاب بہت عالمانہ اور کچھ غیر واضح تھی اس لیے لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ وہ نہایت اعلیٰ ذوق اور گہری سوچ کا حامل شخص ہے۔ ووہوان ایک ایسا شخص تھا جس پر دنیا اِدھر سے اُدھر ہو

جانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور وُہ زندگی کو اپنے ڈھنگ سے گزارتا چلا جاتا تھا۔ آپ اُس کی نیند نہیں چھین سکتے تھے، بھوک نہیں اُڑا سکتے تھے اور کبھی اُسے کسی کے لیے آنسو بہاتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر شی یانان کسی فلم یا کتاب کے مرکزی کردار کی بدقسمتی کے بارے میں آبدیدہ ہو جاتا تو ووہوان صرف ایک جمائی لیتا اور کندھے سکیڑ کر ناپسندیدگی سے کہتا: ''تم اسے اتنی سنجیدگی سے کیوں لے رہے ہو؟'' کمپوچیا پر ویت نام کے حملے کے بارے میں بھی لگتا تھا کہ اُسے برسوں سے علم ہے: ''مجھے معلوم تھا کہ یہ ہونا ہی ہے۔'' وُہ صرف اتنا کہہ دیتا۔ زندگی کی روزمرہ روٹین کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ پکا قنوطی تھا اور کوئی شے اُس کی طنز کے وار سے بچ نہ سکتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پیدا ہوتے ہی ہر شے پر ناک چڑھانے لگا تھا۔

ووہوان کی رفاقت میں شی یانان کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ وہ ثقافت کے بارے میں لاعلم اور تہذیب سے بے بہرہ ہے کیوں کہ وہ ووہوان کا سرد، لاپروا اور آسمانوں پر پرواز کرتا ہوا طرزِ زندگی نہیں اپنا سکتا تھا۔ شی یانان کو روشنی، رنگ اور آواز کی سنسنی پسند تھی۔ اُس کو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اچھی لگتی تھیں جیسے بہار کے جشن میں طویل دوڑ، ڈاکخانے کے باہر قطار میں کھڑے ہو کر ریڈیو کا نظام الاوقات حاصل کرنا، یہاں تک کہ ناقابلِ برداشت حد تک پُر ہجوم بس میں ذرا لطف لینے کے لیے چوری چھپے دوسروں کی گفتگو سُننا۔ اس کے علاوہ اُسے ووہوان کی وہ ٹیپ بھی پسند نہیں آئی تھی جس میں ہانگ کانگ کی مِس خوشبودار خواب کے مشہور گانے ''نیلے جھمکے'' اور ''تم جیسا اور کوئی نہیں'' شامل تھے۔ اُسے تو اُنھیں سنتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی سخت شلجم کھا رہا ہے۔ لیکن اُسے جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے ان خیالات کا اظہار کر سکے۔ وُہ اِس بات کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ ووہوان اُس کا مذاق اُڑانے اور اسے غیر مہذب اور ٹھنڈے دماغ کا نہ ہونے کا طعنہ دے۔

ذرا آرام سے۔۔۔۔۔۔ ٹھنڈے دماغ سے۔۔۔۔۔۔ جب ووہوان اُس کا خط لایا اُس کا چہرہ کیکڑے کے رنگ کا ہو گیا جسے ابھی ابھی کڑکڑاتے ہوئے تیل میں ڈالا گیا ہو۔ وہ اتنا شرمسار تھا کہ مر جانا چاہتا تھا۔۔۔۔ وہ شرما کیوں رہا تھا؟ ووہوان کیا سوچتا ہو گا؟''

اُس کے سُرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے ووہوان نے بے حد لاپروائی سے پوچھا کہ کس کا خط ہے؟

شی یانان نے پُوری کوشش کی کہ اس سوال کو ٹال دیا جائے۔

''محبت نامہ؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مجھے تمھاری محبوبہ کے بارے میں علم نہ ہو؟''

شی یانان نے ایسی مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلا لی جس میں اقرار تھا نہ انکار۔

بہتر ہے وہ اِس خط کو محبت نامہ سمجھتا رہے، بجائے اس کے کہ اُسے یہ معلوم ہو کہ دراصل یہ کیا ہے۔ اگر وو ہوان کو پتا چل گیا کہ وہ چوری چھپے نظمیں لکھتا ہے تو وہ سب اُس کا مذاق اُڑائیں گے۔

شی یانان نے خط نکالنے سے پیشتر اطمینان کرلیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ وہ لفافے پر دکھائی دینے والے پختہ طرزِ تحریر کو دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر وہ شے، جس کے لیے وہ اِس لکھنے والے کی پرستش کرتا تھا، اُس کے سامنے ہے۔ وُہ خوش بھی تھا اور کچھ بدحواس بھی تھا۔ اُس نے ایک جریدے میں اِس شاعر کی چند نظمیں پڑھی تھیں۔ یہ نظمیں تازہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح تھیں جس نے اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دل کے تار ٹوٹ جاتے اُس نے فوراً اپنے خیالات کے اظہار کے طور پر ایک خط لکھ کر شاعر کو روانہ کردیا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کے جذباتی سے خط کا اتنا دوستانہ جواب آئے گا۔ لکھا تھا اسے جب بھی وقت ملے وہ آ جائے اور شاعری کے بارے میں گفتگو کرلے۔ اس خیال سے اُسے وحشت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے اپنی شاعری اُس صاحبِ فن شاعر کی خدمت میں پیش کرے گا۔ یہ ایسے تھا جیسے آپ برہنہ حالت میں پکڑے جائیں۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی جرأت کرسکے گا۔

یک دم یوں لگا جیسے بس میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں رہی۔ ایک بوڑھی عورت خیدان مارکیٹ تک کا ٹکٹ خریدنا چاہتی تھی۔ ٹکٹ بیچنے والی حساب لگا رہی تھی کہ کتنے کا ٹکٹ ہوگا کہ ایک لوفر نے یکدم کہا: ''دس سینٹ۔''

ٹکٹ خریدنے والوں کے ہجوم میں ٹکٹ فروخت کرنے والی ٹھیک طرح سے سوچ نہ سکتی تھی اور وُہ دس سینٹ کا ٹکٹ کاٹنے کو تھی کہ وو ہوان نے سرگوشی کی: ''صرف پانچ سینٹ بنتے ہیں، دس نہیں'' اُس نے آنکھیں جھپکائیں اور شرما گئی۔ اُس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا: ''یہاں اتنا رش ہے کہ میں غلط ٹکٹ دینے والی تھی۔'' اُس نے وو ہوان کی جانب تشکر نظروں سے دیکھا اور اُس کے ہونٹ کونوں سے اوراُوپر اُٹھ گئے۔

وہ بدتمیز لڑکا بے حیائی سے مسکرانے لگا۔ وو ہوان اُس کی طرف بھاگا۔ اُس نے وو ہوان کا کھلاڑیوں جیسا مضبوط جسم اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو یک دم اپنی مسکراہٹ پی گیا۔

شی یانان ووہوان کو پسند کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر شے وہ اتنی آسانی سے کر لیتا تھا، یہاں تک کہ ایک لڑکی کو اپنی طرف مائل کر لینا بھی اُس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اب ووہوان بڑے ٹھہرے ہوئے اور ذرا دکھاوے کے انداز میں کیوں مسکرائے جارہا تھا؟ لگتا تھا ووہوان کو ہمیشہ اپنے مرتبے کا احساس رہتا تھا۔ اُس کی مربیانہ مسکراہٹ کی وجہ سے شی یانان گرفتہ خاطر ہو گیا۔

ٹکٹ بیچنے والی آہستہ آہستہ اُن کو بہتر طریقے سے جاننے لگی تھی۔ اگر اُن میں سے کوئی ایک موجود نہ ہوتا تو وُہ زبان سے کچھ نہ کہتی لیکن اُس کی آنکھوں میں فکرمندی ہوتی۔ لگتا تھا وُہ پوچھ رہی ہے: ''وہ چمڑے کی جیکٹ والا کہاں ہے؟ کیا وہ بیمار ہے؟'' لیکن جب ٹکٹ چیک کرنے کا مرحلہ آتا تو وہ کوئی رعایت نہ کرتی۔ پھر وہ ہمیشہ کی طرح اکھڑ جاتی۔ ووہوان نے اُس کے اِس رویے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ وُہ کبھی بھی اُسے اپنا ماہانہ پاس فوراً نہ دکھاتا بلکہ انتظار کرتا کہ وہ کہے کہ'' کامریڈ آپ کا ٹکٹ؟'' تب وہ بیزاری کے ساتھ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا اور پاس دکھا دیتا۔ کبھی کبھار وہ اُسے اپنی ملازمت کا کارڈ دکھا کر دھوکہ دینا چاہتا یا اپنے بٹوے کو فضا میں لہرا دیتا۔ بہرحال وہ اسے چکر دیتا رہتا اور کافی دیر کے بعد پاس دکھاتا۔

جب ووہوان خوشگوار مُوڈ میں ہوتا تو کسی برگزیدہ ہستی کی طرح ہو جاتا۔ وہ بس پرامن وامان قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا۔ پیسے دوسروں سے لے کر اُسے پہنچاتا اور ٹکٹ مسافروں کو تھماتا اور دھیان رکھتا کہ کوئی مسافر بلاٹکٹ نہ اُتر جائے۔ وہ یہ سب کچھ اتنے فطری طریقے سے کرتا کہ وہ لڑکے، جو اپنے مردانہ وقار کو آڑ بنائے اُس کی مدد کرنے سے ہچکچاتے تھے، بے حد شرمندہ ہوتے۔ شی یانان کے لیے یہ پُروقار اور شاندار رویہ ایک کھیل کی حیثیت رکھتا تھا، ایک خاکہ، جو ڈراما سکول کے چند طالب علموں نے پیش کیا ہو۔

صرف اُس کی بس پر سواری کرنے کے لیے ووہوان، جو روزانہ دیر سے جاتا تھا، اب صبح سویرے بیدار ہو کر بس سٹاپ پر چلا جاتا۔ کام کے بعد وہ حسبِ سابق فوراً گھر نہیں چلا جاتا تھا بلکہ تیز ہوا میں کھڑا رہتا تھا اور بے شمار بسیں آ کر چلیں جاتیں لیکن وہ صرف بس نمبر 1176 پر ہی سوار ہوتا۔ گروہ کے باقی لڑکوں نے اُسے چھیڑنا شروع کر دیا۔ سب کا یہی خیال ہے کہ ووہوان بُری طرح عشق میں مبتلا ہو چکا ہے اور دوسرے لوگوں کی طرح عشق کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن شی یانان ان باتوں سے زیادہ خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ وُہ ایک نامعلوم

سی نفرت محسوس کرتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک نفیس اخلاق کی مالک خاتون کی شہرت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

وو ہوان نے ہنستے ہوئے اُس سے دریافت کیا کہ آخر بات کیا ہے؟ مسئلہ کیا ہے؟۔

''کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔تم۔۔۔۔تم آخر اُس سے کیا چاہتے ہو؟''

''کیا مطلب کہ میں اُس سے کیا چاہتا ہوں؟'' اور پھر جیسے ایک بچے کو چھیڑتے ہیں اُس نے پوچھا!''تم کیا چاہتے ہو کہ میں اُس سے کیا چاہوں؟''

شی یانان کو وہ موسمِ گرما یاد آیا جب اُس کا باپ اُسے چھٹیوں کے دوران ساحلِ سمندر پر لے گیا تھا۔ سمندر کے مدو جزر میں ایک خوبصورت شیل مچھلی بار بار ساحل پر آ رہی تھی۔ وہ شاید اس خیال میں تھی کہ ساحل پر آ کر بار بار سمندر میں لوٹ جائے گی لیکن ایک بار وہ وہ واپس نہ جا سکی اور اُسے ایک کھلنڈرے بچے شی یانان نے اُٹھا لیا۔ سمندر کے پانیوں سے باہر خوبصورت شیل مچھلی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی۔ اُس کی خوبصورت زندگی کو تلف کر دینے کا احساس زندگی بھر اُسے ستاتا رہتا۔ شی یانان شاید ساری عمر اس احساسِ جُرم میں مبتلا رہتا اگر ایک حادثہ اُسے اِس سے نجات نہ دلا دیتا۔

جونہی شی یانان عجائب گھر میں ایک تصویر کو بہتر طریقے سے دیکھنے کے لیے دو قدم پیچھے ہٹا ایک نوجوان لڑکی درمیان میں حائل ہوگئی۔ اُس نے ایک جانب ہو کر تصویر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر اُس نے لڑکی کا چہرہ دیکھا اور اُسے پہچان لیا۔ وُہ ٹکٹ بیچنے والی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں چوری چھپے اس کا پیچھا کرنے لگا اور ساری دوپہر اُس کے پیچھے پھرتا رہا۔ وہ سادہ کھیتوں اور چراگاہوں کے زمینی مناظر پسند کرتی تھی۔ کھیت ایک چاندی ایسے چاند تلے، چھوٹے چھوٹے بچھڑے گھنے درختوں کے سایے میں گھاس چرتے ہوئے، بیدِ مجنوں دریا کی سطح کو چھوتے ہوئے، بارش سے دھویا ہوا آسمان جہاں ہلکی ہوا میں زرد پھولوں کی پتیاں اُڑتی ہیں۔ یہ رنگین تصاویر اُسے ایک ناقابلِ بیان مسرت سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ اُس کے چہرے کا یہ تاثر ایک اور خوبصورت تصویر بنانے کے لیے کافی تھا۔۔۔۔۔۔اور کسی اور شے کی موجودگی اس تصویر کو خراب نہیں کر سکتی تھی چاہے وہ وو ہوان ہی کیوں نہ ہو۔

جب وہ چلی گئی تو شی یانان نے اُن تصاویر کو غور سے دیکھا جو اُسے بے پناہ پسند آئی تھی۔ ایک معمولی ٹکٹ بیچنے والی سے اس طرح کے خوبصورت ذوق کی بھلا کون اُمید رکھ سکتا تھا۔

اُس نے اس کے ہر صبح بس میں سوار ہونے کے بارے میں سوچا جب کہ وہ ابھی اپنے غریبانہ ناشتے کا آخری ٹکڑا چب رہی ہوتی تھی۔ وہ اکثر دیکھتا کہ وو ہوان اُس کی جانب بہت ترحم آمیز مسکراہٹ سے دیکھ رہا ہے۔ اُس مسکراہٹ سے وہ اندازہ لگا تا کہ شاید وو ہوان نے ڈبل روٹی اور مکھن اور چاکلیٹ اور دودھ کا ناشتہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔کیا یہ ناشتہ ٹکٹ بیچنے والی کے ناشتے کی نسبت زیادہ شریفانہ اور شاہانہ تھا؟

وو ہوان ساری دوپہر عجیب سا محسوس کرتا رہا کیونکہ اُس کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ اُس کے پیغام کے بارے میں کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کرے گی۔ کیا زندگی کی شاہراہ پر اسے ہمیشہ سے سبز بتی روشن نہیں ملتی رہی؟

اُس نے شی یانان کے اُس بیوقوفانہ سوال کے بارے میں سوچا جو اس نے کبھی کیا تھا۔ ''تم۔۔۔۔آخر تم اس سے کیا چاہتے ہو!'' تو کیا ہے؟ اگر وہ کہہ دیتا کہ اسے اس سے محبت ہے تو دراصل یہ صحیح نہ ہوتا کیوں کہ وہ اِسے فتح کرنے کی ایک ناقابل برداشت خواہش رکھتا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیوں کرتی تھی جیسا وہ دوسروں کے ساتھ کرتی تھی؟ وہ ہمیشہ اتنی مؤدب، مہربان اور شفیق کیوں تھی کہ لوگوں کی بس میں چڑھنے اور اترنے میں مدد کرتی تھی، اُس اپاہج لڑکے کے لیے ہمیشہ ایک نشست کا بندوبست کرتی تھی جو امیروں کی گلی سے بس میں سوار ہوتا اور رخیدان مارکیٹ اُتر جاتا تھا۔ اُس نے پہلے دن سے ہی یہ کیوں نہیں جان لیا کہ میں اُسے اپنی جانب ملتفت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیا یہ طے نہیں تھا کہ زندگی اسے دوسرے کی نسبت زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کے لیے تھی!

جونہی وہ بس سے اُترے وو ہوان نے شی یانان سے یہ کہہ کر چھٹکارا کر لیا: ''تم پہلے چلے جاؤ، میرا خیال ہے کہ کل میں اپنی کتاب بس میں ہی بھول آیا ہوں۔

میں ذرا اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔'' جونہی اُس نے شی یانان کو دوسری بس میں سوار ہوتے دیکھا وو ہوان بھاگ کر پھر 1176 نمبر بس میں سوار ہو گیا۔ ٹکٹ بیچنے والی بس کی صفائی میں مشغول تھی۔

اُس نے سر اُٹھایا تو وو ہوان کی جلتی ہوئی آنکھوں کو گھورتے پایا۔

''تم نے کل بس میں میری کتاب تو نہیں دیکھی؟''

''کون سی کتاب؟'' اُس نے بڑے کاروباری لہجے میں کہا۔ لگتا تھا کہ اُس نے اپنے

آپ کو اِس ڈرامے کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

''سُرخ حویلیوں کے لیے ایک خواب کی پہلی جلد۔''

''کیا اُس پر تمہارا نام لکھا ہوا ہے؟''

''میری مہر اس پر لگی ہوئی ہے: وو ہوان۔''

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔وہ بس کے اگلے حصے میں گئی اور ایک کُنڈے سے لٹکے کتابوں والے تھیلے میں سے وہ کتاب نکال لائی۔کتاب وو ہوان کے حوالے کر کے وہ پھر صفائی میں لگ گئی۔

وو ہوان نے فوراً کتاب کو کھولا۔اُس میں بے نام اور بے پتہ خط ابھی تک موجود تھا۔اُس کے ایک لمحے کے لیے ذہن پر زور دیا۔اِس نے خط پڑھا ہے یا نہیں؟ اِس نے نہیں پڑھا تو پھر کتاب گمشدہ چیزوں کے دفتر میں کیوں جمع نہیں کروائی؟ اِس کا مطلب ہے اُس نے خط پڑھا ہوگا اور اُسے معلوم ہوگا کہ میں آؤں گا اور اسی لیے اُس نے اِسے سنبھال لیا ہوگا۔لیکن اگر ایسا ہوا تھا تو اُس نے خط اپنے پاس کیوں نہیں رکھ لیا؟

''معاف کیجئے گا۔۔۔۔۔۔''

''کیا کچھ اور بھی ہے؟''

''تم نے اِس کتاب کو گمشدہ چیزوں کے دفتر میں کیوں جمع نہیں کروایا؟''

''میرا خیال تھا کہ اِسے کوئی نہ کوئی لینے آ جائے گا۔''

''تم نے شاید توجہ نہیں کی اس میں تمھارے لیے ایک خط تھا۔''

نہ تو وہ شرمائی اور نہ ہی اُس نے شرمندگی محسوس کی جیسا کہ ایسی صورتِ حال میں دوسری لڑکیاں کرتی ہیں۔اُس نے ادھر اُدھر دیکھنے کی بجائے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔اُس کا چہرہ جو عام حالات میں بہت نرم اور خوشگوار ہوتا تھا یک دم بہت کرخت ہو گیا۔اُس کا لہجہ بہرحال نارمل رہا: ''اچھا۔۔۔۔۔۔۔کیا یہ کچھ بیہودہ سی بات نہیں ہے؟'' اگر تم اپنا احترام نہیں کرتے جو تمھیں کرنا چاہیے تو کم از کم دوسروں کا احترام تو کیا کرو۔تمھیں ہمیشہ ایک بات یاد رکھنی چاہیے: کچھ بھی ہو جائے اپنی بےعزتی نہ کرنا۔شاید میں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے لیکن ذرا سمجھنے کوشش کرو کہ میں صرف تمھارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔''

وو ہوان کم از کم عام ''لفنگوں'' سے تو بہتر تھا اس لیے وہ اب بھی ٹکٹ بیچنے والی کی

مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔۔۔۔۔۔صرف ایک مسئلہ تھا۔اب اُس کے شوق پر اداسی پڑ چکی تھی۔وہ اپنی برہمی اور مایوسی پر پردہ نہیں ڈال سکتا تھا۔اُسے کون اشتعال دلا رہا تھا؟ کوئی بھی نہیں۔وُہ خود ہی اُسے اشتعال دلانا چاہتا تھا لیکن اُس کی موجودگی میں ایک بے مثال شکست سے دوچار ہو جاتا۔یوں لگتا تھا جیسے اُس کی تمام تر کوششیں ربڑ کی ایک گیند کی طرح اُچھل کر واپس آ جاتی ہیں۔یہ تو طے تھا کہ بے شمار چیزیں وُہ بغیر کوشش کے حاصل کر لیتا تھا لیکن کچھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو وہ حاصل نہیں کر سکتا تھا مثلاً اُس کی عزت، اُس کا پیار۔وُہ تو اُس کی توجہ بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔وُہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وُہ ہتھیار کیوں نہیں ڈال رہی تھی۔وہ کیا کرے کہ اُس پر غلبہ پا سکے؟ اُس نے اس صورتِ حال کو اُلٹ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا جس نے اسے شکست خوردگی کے احساس سے ہمکنار کر رکھا تھا۔

شاید وُہ اُسے تاؤ دلا کر کامیاب ہو جائے، یعنی یہ بھی تو ایک قسم کی فتح ہوگی۔بالآخر اسے کچھ تو حاصل ہوگا، اس کی ناراضگی ہی سہی! اُس کے اندر یقیناً کوئی شیطان تھا جو اُسے ایسی باتوں پر اُبھار رہا تھا۔وُہ اپنے روایتی ٹھنڈے مزاج کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

اِس حقیقت کو ہر کوئی جانتا ہے کہ مہینے کے آغاز میں ٹکٹ بیچنے والے عام حالات کی نسبت ٹکٹوں کو زیادہ احتیاط سے چیک کرتے ہیں۔جب وو ہوان بس سے اُترا تو اُس نے ٹکٹ دکھانے کے لیے اُس کی درخواست پر کان نہ دھرا۔وُہ بھاگ کر اُس کے پیچھے پہنچی: ''آپ کا ماہانہ پاس، مہربانی۔۔۔۔۔۔''

اُس نے جان بوجھ کر ناراض لہجے میں کہا: ''میرے پاس نہیں ہے۔''

شی یانان اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا: ''کون کہتا ہے کہ نہیں؟ تم نے ابھی تو خریدا ہے۔'' وو ہوان نے سُنی ان سُنی کر دی۔اُس نے اُس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور ٹکٹ بیچنے والی کو گھورتا رہا۔

وُہ فوراً سمجھ گئی کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔اُس نے ملائم الفاظ سے اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی: ''کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارے پاس نہیں ہے؟ تمھیں صرف اسے جیب سے نکال کر مجھے دکھانا ہے۔جو کوئی بھی بس سے اُترتا ہے اُس کا ٹکٹ چیک کیا جاتا ہے۔'' لیکن اُس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔وُہ ڈھٹائی سے ہی کہتا رہا کہ اگر میں کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس پاس نہیں ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ نہیں ہے۔

ٹکٹ بیچنے والی کا لہجہ اب قدرے سنجیدہ ہو گیا: ''پھر تمھیں ایک عدد ٹکٹ خریدنا ہو گا۔''

''کتنے پیسے؟''

''پچاس سینٹ'' اُسے ووہوان کو جُرمانہ کرنا پڑا کیوں کہ وُہ اصرار کر رہا تھا کہ اُس کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ ووہوان نے اپنی جیبیں ٹٹول کر سکوں کی ایک مُٹھی باہر نکالی۔ یہ سب کچھ اُس نے ایک منصوبے کے تحت کیا تھا۔

وُہ اُن سب سکوں کو نہ پکڑ سکی۔ یہ واضح نہیں تھا کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا تھا یا نہیں لیکن سکے زمین پر بکھر گئے۔

شی یانان نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مارنے کی خواہش محسوس کی۔ وُہ چاہتا تھا کہ ووہوان کو گردن سے دبوچ کر اُسے زمین پر پڑے سکے اُٹھانے پر مجبور کر دے۔

ایک بوڑھا شخص موٹے شیشوں کی عینک لگائے چھڑی کے سہارے اُدھر آیا۔ وہ ووہوان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور جیسے کوئی سائنسی مقالہ پڑھا جاتا ہے، کہنے لگا: ''نوجوان مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ اس لیے کہ تمھارا دل اتنا خوبصورت نہیں جتنا تمھارا چہرہ۔''

اب اُس کا وہ خوبصورت چہرہ متغیر ہو گیا۔ اُس کی نسیں پھڑکنے لگیں اور اُس پر ایک نفرت انگیز مسکراہٹ چھا گئی۔ اُس نے ٹکٹ بیچنے والی کو بڑی محنت سے ایک ایک سکے کو گنتے دیکھا جیسے گزشتہ زمانے میں مخیّر حضرات غریبوں کو خیرات دیا کرتے تھے۔

شی یانان نہیں جانتا تھا کہ ووہوان نے یہ بداخلاقی کہاں سے سیکھی ہے لیکن وُہ خود کو نیچ محسوس کر رہا تھا۔ اس ڈرامے نے اسے ٹکٹ بیچنے والی کے لیے تعظیم کے جذبات سے بھر دیا تھا۔

اگر اس کی ملازمت کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز اس طرح اپنی بےعزتی نہ کرواتی۔

ٹکٹ بیچنے والی نے سکوں کے ڈھیر پر سے سر اُٹھایا: ''تم نے مجھے سات سینٹ زیادہ دے دیے ہیں۔'' اور اُس نے بقیہ سکے اُس کی طرف بڑھا دیے۔

''مجھے یہ رقم نہیں چاہیے۔''

''یہ تمھاری اپنی مرضی ہے۔'' اُسنے سکے فٹ پاتھ پر رکھے اور بس میں چلی گئی۔ اُس نے یہ بہت کچھ منصوبہ بندی کے تحت کیا تھا لیکن وُہ اِس منصوبے کی کامیابی پر کوئی خوشی یا اطمینان محسوس نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا سارا بدن سر سے پاؤں تک نچڑ گیا

ہے۔

دوہوان کی خاموشی کے باوجود شی یانان کہہ سکتا تھا کہ وہ جان گیا ہے کہ اس آخری معرکے میں میدان خوبصورت خاتون کے ہاتھ رہا ہے۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟''شی یانان نے پوچھا۔

''دوہوان نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگا:''کیا پچاس سینٹ کے عوض یہ مظاہرہ مہنگا تھا کہ وہ اپنا سرد مزاج بھول کر غیر اخلاقی حرکات پر اُتر آئی تھی؟''

''غیر اخلاقی؟'' ماضی میں شی یانان کبھی کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا تھا جس کی وجہ سے اُن دونوں کے درمیان جو رشتہ تھا اُس میں خلل آتا لیکن اب اُسے غصہ آ رہا تھا۔ ؤہ برداشت نہ کر سکا:''اگر کوئی بداخلاق ہے تو وہ تم ہو۔تم سمجھتے ہو کہ اگر ہم سارا دن صوفوں پر پڑے فلسفے اور موسیقی کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے ہیں، گٹار بجاتے ہیں، ٹیپ سنتے ہیں اور ہم اتنے نواب صاحب ہیں کہ بازار میں بکنے والے سستے کیک ہمارے حلق سے نیچے نہیں جا سکتے تو اِس کا مطلب ہے کہ ہم بہت اعلیٰ اخلاقیات کے مالک ہیں؟ یہ سب بناوٹی ہے! یہ سب کچھ ہم اپنی چھپی بورژوا بداخلاقی کو چھپانے کے لیے کرتے ہیں۔ہم اپنے آپ کو بہت سلجھے ہوئے سمجھتے ہیں لیکن اندر سے ہم بالکل بوسیدہ اور سڑے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔۔''

لیکن دوہوان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اُس نے اپنی تقریر بند کر دی۔

اگر کبھی دوہوان سُورج کو چاند میں بدلتے یا چاند کو سُورج بن جاتے دیکھتا تو شاید اُس کے چہرے کے تاثرات بالکل ایسے ہی ہوتے۔اب تک شی یانان کا خیال تھا کہ اُس کا اور دوہوان کا تعلق اور ایک مضبوط بنیاد پر قائم ہے لیکن ؤہ سخت غلطی پر تھا۔ دراصل وہ دونوں آج تک ایک جمے ہوئے دریا کی سطح پر کھڑے ہوئے تھے۔ بہار کی نرم ہوا آئی اور اُن کے پاؤں تلے کی برف پگھلنے لگی۔اب ؤہ برف کے دو الگ الگ ٹکڑوں پر کھڑے تھے اور جوں جوں دریا پگھلتا جا رہا تھا دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے پرے ہٹتے جا رہے تھے۔

تاریکی گہری ہو رہی تھی۔وہ خاموشی سے سرکلر بس ڈپو کی جانب چل رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔وہ چاہتے تھے اُن کے لفظ، اُن کے محسوسات اُن کے ٹوٹتے رشتے کی طرح ٹوٹ رہے تھے، گم ہو رہے تھے۔

شی یانان یک دم رُک گیا۔اب ؤہ کبھی بھی''بزدل'' کہلوانے سے نہیں ڈرے گا۔

وہ ساری قوت ، جسے وہ اپنی مٹھی میں بھر کر استعمال کرنا چاہتا تھا ، اچانک ایک لفظ میں سما گئی تھی ۔

'' قابلِ نفرت ! '' پھر اس نے آناً فاناً بس ڈپو کے لیے رخصت چاہی ۔ وُہ ٹکٹ بیچنے والی کو کُچھ بتانا چاہتا تھا ۔ کیا بتانا چاہتا تھا ؟ یہ وُہ بھی نہیں جانتا تھا !

وو ہوان اس سے پیشتر کبھی یہ کہہ چکا تھا : '' عورتیں نازک مخلوق ہیں ، خوبصورت عورتیں کچھ زیادہ ہی نازک ہوتی ہیں ۔ ''

شی یانان نے اُسے دوسری شفٹ کے لیے خالی بس میں بیٹھے دیکھا ۔ شفق کی روشنی میں اُس کا سر جُھکا ہوا تھا ۔ اُسے یقین تھا کہ وہ رو رہی ہے بلکہ اُس نے تو چند سسکیاں بھی سُنیں ۔ اگر وُہ اس بات سے خوفزدہ نہ ہوتا کہ وُہ اُسے ایک ایسا لفنگا سمجھ لے گی جو صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو وُہ اُس کے آنسو پُونچھ کر کہتا : '' اِس دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ٹکٹ بیچنے والے معمولی لیکن عظیم پیشے کی عزت کرتے ہیں ۔ ''

ایک بس خاموشی سے پاس سے گزر گئی ۔ اس بس کی روشنی میں شی یانان اُس کا چہرہ بآسانی دیکھ سکتا تھا ۔ نہ صرف یہ کہ وہ رو نہیں رہی تھی بلکہ وہ اپنے خوابوں میں گُم تھی ۔ اُس کے چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ اُس کے پیچھے سوچ کی ایک ایسی لڑکی ہے جو کسی خوبصورت اور دور افتادہ مقام تک جاتی ہے ۔ اُس لمحے شی یانان سب کچھ سمجھ گیا ۔ پختہ عزم اور ذاتی ارادہ کا انحصار سراسر انسان کے اندرونی امن پر ہوتا ہے ۔ یہ ٹکٹ بیچنے والی نہیں تھی جو کہ نازک تھی بلکہ نازک تو وو ہان تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور شاید وہ خود بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خاموشی سے واپس مڑ گیا ۔

وُہ بلا مقصد بارش میں گھومتا رہا ۔ سفیدے کے سفید اور چوڑے پتوں پر پڑنے والے بارش کے قطروں کی آواز سُنتا رہا ۔ اُس نے سوچا کہ لوگ کتنے مختلف ہوتے ہیں ۔ اور کس طرح مختلف لوگوں کو مختلف چیزیں زندگی میں پیش آتی ہیں ۔ یکلخت اُس کے سینے میں اِس سوچ میں کسی اور کو شریک کرنے کی خواہش اُبلنے لگی ۔ بالآخر اسے یہ خیال آیا کہ اس میں اس خوبصورت شاعر کو شریک کیا جاسکتا ہے !

اتوار کے پچھلے پہر شی یانان عام قسم کے گھروں کی قطار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔ وُہ اِس قسم کے رہائشی علاقوں میں بہت کم آتا تھا ۔ یہاں صفائی کے انتظامات بہت ناقص تھے چنانچہ گھروں کے درمیان گندا پانی کھڑا ہو جاتا ہے ۔ چھوٹے لڑکے پھیپھڑوں کا پُورا زور لگا کر چیخ رہے تھے ۔

ایسی جگہ پر مقیم کوئی شخص گہری، زندگی سے بھرپور، فلسفے سے لبریز تخلیقی تحریریں کیسے لکھ سکتا ہے؟ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ شاید کوئی بہت ہی خاص قسم کا شخص ایسا کر سکتا تھا۔ اُس نے بہت جلد ہی وہ پتا ڈھونڈ لیا جس کی اسے تلاش تھی۔ دروازہ کھلا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ٹکٹ بیچنے والی اُس کے سامنے کیا کر رہی ہے؟ اُس نے مسکرا کر اُسے خوش آمدید کہا: ''اچھا تو یہ تم ہو؟ کیسے ہو؟ کس کو تلاش کر رہے ہو؟''

''میں تیان یے کو تلاش کر رہا ہوں۔'' اُس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں ہی تیان یے ہوں۔''

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُس کا تخیل کتنا وسیع اور بلند تھا کیوں کہ وُہ شاعر کی شخصیت کو ٹکٹ بیچنے والی شخصیت سے نہیں ملا سکتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ شاعر ایک بوڑھا اور کاروباری ادیب ہوگا۔ اُس کی وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ اتنا نوجوان ہوگا اور صرف اپنے فارغ وقت میں لکھتا ہوگا۔

''کیا میں تمھارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟''

شی یانان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اُس نے اتنا احمقانہ جھوٹ کیوں بول دیا ''میں شی یانان کا دوست ہوں۔ میں کسی کاروباری سلسلے میں ادھر آ رہا تھا چنانچہ اُس نے مجھے ایک پیغام پہنچانے کے لیے دے دیا۔ وہ آئندہ چند دنوں میں کسی روز آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ آپ کب فارغ ہوں گی؟'' اُس کی ذہین آنکھیں صبر اور معاملہ فہمی سے لبریز تھیں۔ ''اگلے ہفتے میری صبح کی شِفٹ ہوگی۔ میں شام کو گھر ہوں گی۔ اُسے کہیے گا کہ وُہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ کیا تم اندر آ کر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھنا پسند نہیں کرو گے؟''

شی یانان بوکھلا گیا ''آ۔۔۔۔۔۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔میں پھر کبھی آ جاؤں گا۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

یک لخت اُس کا سر اُس باقی ماندہ چائے سے دھویا گیا جو اوپر والی منزل کی کھڑکی سے کسی نے اپنی پیالی میں سے پھینکی تھی۔ اس نے یہ جاننے کے لیے کہ کس نے ایسا کیا ہے اوپر دیکھنے کی ہمت نہ کی اور نہ ہی اِس چائے کو اپنے سر سے پونچھ سکا۔ وُہ ایک مفرور مُجرم کی طرح وہاں سے فوری طور پر غائب ہو گیا۔

گھر پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ اُس نے کیا حماقت کی تھی ۔ اُس کو تو تمام عرصہ علم تھا کہ

وہی شی

یا نان ہے ۔ کیا وو ہوان نے بس کے سفر کے دوران کبھی اُس کے سامنے یہ نام نہیں پکارا تھا ؟

وُہ اب بس نمبر 1176 پر دوبارہ سوار نہیں ہونا چاہتا تھا ۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کیوں لیکن اُسے یوں لگا جیسے وو ہوان کے رویے کے لیے وہ بھی موردِ الزام ٹھہرتا ہے ۔ اِس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ فیکٹری اُس کے گھر سے بہت دور تھی ۔ اُس نے آج کے بعد سے سائیکل پر سفر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا ! وہ روزانہ بس نمبر 1176 کو پاس سے گزرتے دیکھتا ۔ جب بھی وہ بس قریب سے گزرتی وہ اپنے آپ سے کہتا : '' عزیز دوست ، اُس وقت تک انتظار کرو جب میں بھی تھوڑا سا تم جیسا ہو جاؤں ۔ پھر میں تمھیں ملنے آؤں گا ۔ ابھی میں اس کے لیے تیار نہیں ۔ ''

امرتا پریتم
(بھارت)

بوٹی

انگوری میرے ہمسائے کے ہمسائے کے ہمسائے۔۔۔۔۔کے بوڑھے نوکر کی نئی دلھن تھی۔یُوں تو ہر دلھن نئی ہوتی ہے لیکن وہ ذرا مختلف طریقے کی نئی تھی۔اپنے دو مرتبہ شادی شدہ خاوند کی دوسری بیوی جو صرف اس لیے نئی نہیں کہلا سکتی تھی کہ اس کا انگوری کے حصے میں اس لیے آتا تھا، اور یہ اعزاز کم از کم پانچ برس تک برقرار رہا کہ بوڑھے نوکر کو شادی کی حیثیت ''قانونی'' بنانے میں اتنا عرصہ لگ گیا تھا۔یوں وہ یہاں صرف چند ماہ سے تھی اور اُس میں ابھی تک دیہاتی تازگی اور لڑکپن موجود تھا۔

تقریباً چھ برس پیشتر پرابھاتی اپنی پہلی بیوی کے کریا کرم کے لیے گاؤں گیا تھا۔جب یہ سب ہو چکا تو انگوری کا باپ اُس کے پاس آیا اور اُس کے گیلے تولیے کو پکڑ کر نچوڑا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ ڈھ آنسو، جنھوں نے تولیے کو گیلا کیا تھا، پونچھ دیے گئے ہیں۔یوں تو کوئی مرد بھی اپنی بیوی کے لیے اتنا نہیں روتا کہ ڈیڑھ گز سفید سوتی کپڑے کو گیلا کر دے۔یہ تولیہ تو پرابھاتی کے غسل کے بعد گیلا ہو گیا تھا۔بہر حال ایک نوجوان اور شادی کے قابل بیٹی کے باپ کا یہ عمل کہ ڈھ آنسوؤں سے گیلا تولیہ نچوڑ دے صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ ''میں مرنے والی کی جگہ اپنی بیٹی تمھیں دیتا ہوں۔اب آنسو پُونچھ ڈالو۔میں نے تو تمھارا تولیہ بھی خشک کر دیا ہے''۔

انگوری کی شادی پرابھاتی سے ان حالات میں ہوئی لیکن ان کے ملاپ کو پانچ برس کے لیے ملتوی کر دیا گیا اور اس کی دو وجوہات تھیں: اس کی کم عمری اور اُس کی ماں پر ہونے

والے فالج کے حملے۔ بالآخر جب پرابھاتی کو اپنی بیوی لے جانے کی دعوت دی گئی تو یُوں لگا جیسے یہ ممکن نہ ہو کیوں کہ اُس کا مالک اپنے باورچی خانے میں سے ایک اور پیٹ کو بھرنا پسند نہیں کرتا تھا۔لیکن جب پرابھاتی نے اُسے بتایا

کہ اُس کی نئی بیوی اپنا بندوبست آپ کرلے گی تو مالک مان گیا۔شروع شروع میں انگوری نے مردوں اور عورتوں سے پردہ کیا۔لیک آہستہ آہستہ یہ کھسکتا ہوا اُس کے بالوں تک چلا گیا اور ایک کٹر ہندو عورت کے لیے یہی مناسب تھا۔وہ دیکھنے اور سننے میں بہت پُر لطف تھی۔جھانجھر میں جھنکتے ہوئے ہزاروں گھنگرو اور اُس کے قہقے میں کھنکتی ہوئی گھنٹیاں۔

''انگوری تم نے کیا پہن رکھا ہے؟''

''ایک جھانجھر۔۔۔۔کیا یہ پیاری نہیں؟''

''اور تمھارے انگوٹھے میں کیا ہے؟''

''ایک انگوٹھی۔''

''اور تمھارے بازو پر؟''

''ایک بار''۔

''اور جو کچھ تم نے ماتھے پر پہن رکھا ہے اُسے کیا کہتے ہیں؟''

''اس کو کلی بند کہتے ہیں؟''

''تمھاری کمر کے ساتھ آج کچھ نہیں انگوری؟''

''وہ بہت بھاری ہے۔میں اسے کل پہنوں گی۔آج ہار بھی نہیں پہنوں گی کیوں کہ ذرا دیکھو،اس کا کلپ ٹوٹ گیا ہے۔کل میں شہر جا کر نیا کلپ خریدلوں گی اور اُس کے علاوہ ایک نتھ بھی۔میرے پاس ایک بڑی ساری نتھ تھی جو میری ساس نے رکھ لی۔''

انگوی کو اپنے چاندی کے زیوروں پر بڑا مان تھا اور وُہ بھی اُس کے لمس سے دمکتے تھے۔وہ جو کچھ بھی کرتی زیوروں کی شان میں اضافہ ہوتا جاتا۔

رُت بدلنے سے موسم بھی گرم ہو گیا تھا۔انگوری کو بھی اپنے جھونپڑے میں اس کا احساس ہوا ہو گا، جہاں وہ دن کا زیادہ حصہ گزارتی تھی،اس لیے اب اُس نے بھی باہر رہنا شروع کر دیا۔میرے گھر کے سامنے چند بڑے بڑے نیم کے درخت تھے اور اُن کے نیچے ایک پُرانا کنواں تھا جسے صرف عمارتیں تعمیر کرنے والا کوئی مزدور،اور وُہ بھی کبھی کبھار،استعمال کرتا

تھا۔ کنویں کے گرد جو پانی گرتا وہ آس پاس کی ہوا کو ٹھنڈا رکھتا۔ وہ اکثر کنویں پر آرام کرنے کے لیے آ جاتی۔ ''بی بی آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟'' انگوی نے ایک روز، جب کہ میں نیم کے درخت تلے پڑھ رہی تھی، دریافت کیا۔

''کیا تم اسے پڑھنا چاہتی ہو؟''

''میں پڑھ نہیں سکتی۔''

''سیکھنا چاہتی ہو؟''

''نہیں نہیں''۔

''کیوں نہیں؟ اس میں کیا حرج ہے؟''

''عورتوں کے لیے پڑھنا لکھنا گناہ ہے''۔

''اور مردوں کے لیے؟''

''اُن کے لیے یہ گناہ نہیں ہے۔''

''تمھیں یہ فضول باتیں کس نے بتائیں؟''

''مجھے خود پتا ہے۔''

''میں پڑھ رہی ہوں تو گناہ کر رہی ہوں؟''

''شہری عورتوں کے لیے یہ گناہ نہیں ہے، گاؤں کی عورتوں کے لیے ہے۔'' ہم دونوں اس فقرے پر ہنسنے لگیں۔ اُس نے ابھی جو کچھ اُسے بتایا جاتا تھا، اُس کے بارے میں سوال کرنا نہیں سیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اُسے ان خیالات میں سکون ملتا ہے تو میں خواہ مخواہ کیوں اُن کے بارے میں شک کا اظہار کروں!

اُس کی سیاہ رنگت پر اُس کا بدن حاوی ہو جاتا تھا۔ اُس میں سے لذت کا ایک شدید احساس پھوٹتا رہتا تھا اور ایک ایسا میٹھا پن جو بار بار جھلکتا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کا جسم گُندھے ہوئے آٹے کی طرح ہوتا ہے۔ کچھ عورتوں کا جسم ڈھیلے آٹے جیسا ہوتا ہے جسے اچھی طرح سے گوندھا نہ گیا ہو۔ اور کچھ کا بُری طرح چپٹنے والا جیسا کہ اچھی طرح سے گوندھا گیا آٹا ہوتا ہے۔ بہت کم کسی عورت کا جسم ایسا ہوتا ہے جس سے اچھی طرح سے گوندھا ہوا آٹا پکانے والے کے لیے قابلِ فخر۔ انگوری کا جسم ایسا ہی تھا۔ اُس کی لہریں لیتے ہوئے بدن میں لوہے کے سپرنگ ایسی لچک تھی۔

میں اپنی آنکھوں سے اُس کے چہرے، بازو، چھاتیوں اور ٹانگوں کو محسوس کرتی اور مُجھ میں ایک نیم مدہوشی کی کیفیت جنم لینے لگتی۔ میں نے پرابھاتی کے بارے میں سوچا: بوڑھا، پستہ قد، ڈھیلے جبڑے والا۔ اگر یونانی جیومیٹری دان یُوکلڈ اُس کے قد اور ہڈیوں وغیرہ کی ساخت دیکھ لیتا تو فوراً فوت ہو جاتا۔ یک دم مُجھے ایک مزاحیہ بات سُوجھی۔ انگوری کا آٹا پرابھاتی ڈھانپے ہوئے تھا۔ وُہ اُسے ڈھانپنے والا ایک کپڑا تھا، اُسے چھُپنے والا نہیں تھا۔ میرے اندر ایک قہقہ جنم لے رہا تھا لیکن میں نے اُس کا گلا گھونٹ دیا کیوں کہ مُجھے ڈر تھا کہ انگوری میرے قہقہے کی وجہ جان جائے گی۔ میں نے اُس سے پُوچھا کہ جہاں سے وُہ آئی ہے وہاں شادیاں کس طرح ہوتی ہیں؟

''لڑکیاں جب پانچ چھ برس کی ہوتی ہیں تو کسی کے پاؤں کی پرستش کرنے لگتی ہیں۔ بس وُہی خاوند ہوتا ہے''۔

''اُس کا باپ پیسے اور پھُول اُس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے''۔

''یعنی باپ کرتا ہے، لڑکی تو نہیں کرتی؟''

''وہ یہ سب کُچھ لڑکی کے لیے ہی تو کرتا ہے۔ تو یہ لڑکی ہی ہوئی۔''

''لیکن لڑکی نے تو اُسے پہلے نہیں دیکھا ہوتا''۔

''ہاں، لڑکیاں نہیں دیکھتیں''۔

''کیا ایک بھی لڑکی اپنے ہونے والے خاوند کو نہیں دیکھتی؟''

''نہیں۔۔۔۔۔'' وہ ہچکچائی۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد اُس نے کہا۔ ''جو محبت کرتی ہیں۔۔۔۔۔ وُہ دیکھ لیتی ہیں''۔

''کیا تمھارے گاؤں میں بھی لڑکیوں کو محبت ہو جاتی ہے؟''

''ہاں کُچھ ایسی ہوتی ہیں۔''

''جو محبت کرتے ہیں وُہ گناہ نہیں کرتے؟'' میں نے تعلیم کے بارے میں اُس کے خیالات یاد رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ گناہ ہے۔۔۔۔۔ بہت بڑا گناہ''۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ ''وہ ایسا نہیں کرتیں۔۔۔۔۔ ہوتا یہ ہے کہ کوئی مرد لڑکی کو جڑی بوٹی کھلا دیتا ہے اور وُہ اُس سے پیار کرنے لگتی ہے''۔

''کون سی جڑی بوٹی؟''

''جنگلی''۔

''کیا لڑکی کو پتا نہیں چلتا کہ اُسے جڑی بوٹی دی جا رہی ہے؟''

''نہیں وُہ اُسے پان میں رکھ کر دے دیتا ہے۔اس کے بعد وہ صرف اُس کے ساتھ رہ کر خوش ہوتی ہے، اپنے مرد کے ساتھ۔ مُجھے پتا ہے۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے''۔

''تم نے کس کو دیکھا تھا؟''

''ایک سہیلی کو۔۔۔۔ وہ عمر میں مُجھ سے بڑی تھی۔''

''کیا ہوا؟''

''وہ پاگل ہوگئی اور اُس کے ساتھ شہر بھاگ گئی''۔

''تم کیسے جانتی ہو کہ یہ سب کچھ اُس بُوٹی کے کھانے سے ہوا؟''۔

''اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ وہ اپنے ماں باپ کو کیوں چھوڑتی؟ وُہ اُس کے لیے شہر سے ڈھیر ساری چیزیں لے کر آیا۔ کپڑے، زیور، مٹھائیاں''۔

''یہ جڑی بوٹی آئی کہاں سے ہے؟''

''مٹھائی میں سے۔۔۔۔۔ ورنہ وُہ کس طرح اُس کے ساتھ محبت کرسکتی تھی''۔

''محبت کے تو اور بھی راستے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اور کوئی راستہ نہیں؟''

''نہیں اور کوئی راستہ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ ماں باپ کو تو ایسی لڑکیوں سے بہت نفرت ہوتی ہے''۔

''کیا تم نے اُس بُوٹی کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔ یہ کسی دور کے ملک سے لائی جاتی ہے۔ میری ماں نے مجھے کسی سے بھی پان یا مٹھائی لینے سے خبردار کیا تھا۔ مرد اِن میں بُوٹی ڈال دیتے ہیں''۔

''تم تو بہت سیانی تھیں لیکن تمھاری سہیلی کیسے کھا گئی؟''

''اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے''۔ اُس نے سختی سے کہا اور اگلے لمحے اُس کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا جیسے وہ اپنی سہیلی کو یاد کر رہی ہو۔''وہ پاگل ہوگئی۔ وہ بے چاری پاگل ہوگئی''۔ اُس نے اُداس ہو کر کہا۔''کبھی بالوں میں کنگھی نہ کی؟ ساری ساری رات گاتی رہتی تھی''۔

''وہ کیا گاتی تھی؟''

''پتہ نہیں جب وہ بوٗٹی کھاتی ہیں تو سب گاتی ہیں۔۔۔۔۔اور روتی بھی ہیں''۔

یہ گفتگو بہت طویل ہوتی جا رہی تھی اس لیے میں آرام کرنے چلی گئی۔

ایک روز میں نے اُسے نیم کے درختوں کے نیچے گہری سوچ میں گُم دیکھا۔ عام طور پر جب انگوری کنویں کی جانب آتی تو اس کی آواز سُنائی دے جاتی۔ اُس کی جھانجھر اُس کی آمد کا اعلان کر دیتی اُس روز وُہ خاموش تھی۔

''کیا بات ہے انگوری؟''

اُس نے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا اور اُس کے بعد سنبھل کر کہنے لگی: ''مجھے پڑھنا سکھا دو بی بی۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''مجھے میرا نام لکھنا سکھا دو''۔

''تم لکھنا کیوں چاہتی ہو؟ خط لکھنے ہیں؟ کس کو؟''

اُس نے جواب نہ دیا اور ایک مرتبہ پھر خیالوں میں گُم ہو گئی۔

''یہ گناہ تو نہیں ہو گا!''میں نے پُوچھا تاکہ وہ اپنی اس کیفیت میں سے باہر آ سکے۔

اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں قیلولے کے لیے اندر چلی گئی۔ شام کو جب میں باہر آئی تو وہ ابھی تک وہیں تھی اور گا رہی تھی۔ جب اُس نے میرے قدموں کی آہٹ سُنی تو وُہ مُڑی اور چُپ ہو گئی۔ وُہ شام کی خنک ہوا کی وجہ سے کندھے جُھکائے بیٹھی تھی۔

''تم تو بہت اچھا گاتی ہوئی انگوری''۔ میں نے دیکھا کہ وُہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہے اور پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک زرد مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں گانا نہیں جانتی۔''

''لیکن تم تو جانتی ہو انگوری''۔

''یہ تو وہ والا گانا۔۔۔۔۔''

''وہ گانا جو تمھاری سہیلی گایا کرتی تھی؟''میں نے فقرہ مکمل کر دیا۔

میں نے یہ اُسی سے سُنا تھا''۔

''میرے لیے گاؤ''۔

اُس نے وہ لفظ ادا کرنا شروع کر دیے: ''یہ وہ وقت ہے جب کُچھ بدل جانا چاہیے۔ چار ماہ سردی، چار ماہ گرمی، چار ماہ بارش۔۔۔۔۔۔''

''ایسے نہیں۔۔۔۔اِنھیں گاؤ''۔ میں نے کہا لیکن اُس نے ایسا نہ کیا اور اسی طرح لفظ بولتی رہی۔

''سردیوں کے چار ماہ میرے دل پر راج کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔

میرا دل کانپتا ہے اسے میرے محبوب۔۔۔۔۔۔۔

گرمیوں کے چار ماہ ہوا سورج میں جھلملاتی ہے۔''

''انگوری۔'' میں نے بُلند آواز میں کہا۔ وہ کھوئی ہوئی لگتی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑوں یا جیسے کہ اس نے جڑی بوٹی کھالی ہو۔ میں نے اُس کے کندھے تھام کر پُوچھا کہ کیا وُہ باقاعدگی سے کھانا کھاتی رہی ہے؟ وہ ایسا نہیں کرتی رہی تھی۔ پرابھاتی مالک کے ہاں سے کھاتا تھا اس لیے وہ صرف اپنے لیے کھانا پکاتی تھی''۔ کیا تم نے آج کھانا پکایا تھا؟'' میں نے پُوچھا۔

''ابھی نہیں''۔

''صبح چائے پی تھی؟''

''چائے۔۔۔۔۔دودھ نہیں تھا''۔

''دُودھ کیوں نہیں تھا؟''

''میں نے آج لیا نہیں۔۔۔۔۔۔رام تارا''۔

''تمھارے لیے دُودھ لاتا ہے؟'' میں نے فقرہ پُورا کیا۔ اُس نے سر ہلایا۔ رام تارا چوکیدار تھا۔ انگوری کی شادی سے پہلے رام تارا چوکیداری ختم کرنے کے بعد ہمارے ہاں سے چائے کا ایک پیالہ پی کر کنوئیں کے قریب اپنی کھاٹ پر جا کر لیٹتا۔ انگوری کے آنے کے بعد وُہ، پرابھاتی کے ہاں اپنی چائے بنالیتا۔ وُہ پرابھاتی اور انگوری آگ کے ارد گرد بیٹھ کر اکٹھے چائے پیتے۔ تین دن پہلے رام تارا اپنے رشتے داروں کو ملنے کے لیے گاؤں گیا تھا۔ ''تم نے تین دن سے چائے نہیں پی؟'' میں نے پُوچھا۔ اُس نے پھر سر ہلایا۔ ''اور شاید تم نے کچھ کھایا بھی نہیں؟'' وُہ خاموش رہی۔ اگر اُس نے کُچھ کھایا بھی تھا تو وُہ نہ کھانے کے برابر تھا۔

مجھے رام تارا یاد آ گیا۔ خوش شکل: پھرتیلا اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے والا۔ وُہ مسکراہٹوں کے ساتھ باتیں کرنے کا ڈھنگ جانتا تھا اور اُس کے ہونٹوں کے کونے کانپتے رہتے تھے۔

''انگوری؟''

''جی، بی بی۔''

''کیا یہ بُوٹی کی وجہ سے ہے؟''

آنسواُس کے چہرے سے دوندیوں کی طرح بہنے لگے جواُس کے منہ کے کونوں میں پہنچ کر چھوٹے چھوٹے تالابوں کی صُورت اختیار کر گئے۔

جینیفر کیو لے ڈراسکاؤ
(تھائی لینڈ)

پیارزادہ

گرم موسم میں ملازموں کے کوارٹر اتنے دم گھونٹ دینے والے ہوتے تھے جیسے کہ ساگون سے بنی چائے کی الماریاں لیکن سومپونگ کے لیے اُس کا کمرہ ایک جنت سے کم نہ تھا۔ ؤہ شمال مشرقی تھائی لینڈ سے بنکاک آئی تھی تاکہ دھان کی کھیتوں کی مشقت کی نسبت بہتر زندگی گزار سکے۔ اور چند ہفتے پیشتر تک وہ اتنی زیادہ مایوس بھی نہیں ہوئی تھی کہ معاملات بگڑنا شروع ہو گئے۔ اُس کے پاس سونے کے لیے ایک چٹائی تھی، جس میں اُس کی بہنوں کی ٹانگیں اور بازو گھس کر اُسے پریشان نہیں کرتے تھے۔ آئینہ بھی اُس کا اپنا تھا۔ چاندی کے خنجر کی شکل کا جو بڑے غسل خانے کے اُس آئینے کا ایک حصہ تھا جو اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اُس نے بڑی احتیاط سے یہ ٹکڑے چھپا دیے تھے تاکہ مادام اور راسی کو علم نہ ہو سکے۔ جس کے بارہ چھوٹے بہن بھائی ہوں ؤہ چیزوں کو چھپانے میں بڑا ماہر ہو جاتا ہے۔ ابھی اُسے نرم و نازک چیزوں کو اُٹھانے اور رکھنے کا سلیقہ نہیں آیا تھا اور وہ اب بھی اُن جھڑکیوں سے خوفزدہ رہتی تھی جو اُس کی نالائقی کی بنا پر اُسے پڑتی تھیں۔

سومپونگ نے اپنے عکس کو ستائشی نظروں سے دیکھا حالانکہ وہ ڈراؤنا اور الٹ پلٹ عکس تھا۔ اُس نے اپنی گوری جلد کو تکا اور آنکھوں کو ذرا نیم وا کرنے کی کوشش کی جیسا کہ اُس نے تھائی رقاصاؤں اور چینی اداکاروں کو کرتے دیکھا تھا۔

سومپونگ کو گاؤں کے پرانے طریقے چھوڑنے اور ایک بڑے شہر کے اطوار اپنانے کا

بڑا اشتیاق تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جب وہ سر اٹھائے ، لا پرواہی سے کُولہے مٹکاتی ہوئی ، چمکتے ہوئے ملبوس میں چلتی تھی تو ڈرائیور حضرات کی آنکھیں کیوں اُبل پڑتی تھیں۔ راسمی کے لیے دوڑ بھاگ کے کام کرنے کا صرف ایک ہی فائدہ تھا کہ فٹ پاتھ کی مخلوق مثلاً چھابڑی والے ، بے کار بیٹھے ہوئے لوگ اور ٹیکسی ڈرائیور اُس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے تھے۔

پُرانے زمانوں میں ، جب اُن کی غیر ملکی مادام بنکاک میں نو وارد تھی ، سومپونگ ایک ڈاٹسن ٹیکی میں ، جس کی سیٹیں شوخ پلاسٹک کی تھیں ، پرا تو نام مارکیٹ جایا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ مادام کے خرچے پر لیکن راسمی نے جلد ہی یہ سلسلہ بند کروا دیا۔ راسمی نے سومپونگ کو لاؤ بھی کہا تھا صرف اس لیے کہ اُس نے اُسے سُرخ چیونٹیوں کے انڈے کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سومپونگ کو کیسے پتا چلتا کہ بنکاک کے رہنے والے ایسی چیزیں نہیں کھاتے ؟

وہ کھاتے تھے اور بہت اچھا کھاتے تھے۔ کھانا پکنے کی خوشبو اور تیل کڑکڑانے کی شُوں شُوں آتی ہی رہتی تھی۔ راسمی اس وقت باہر کوئلوں پر جُھکی ہوئی تھی اور ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ تلے ہوئے چاولوں اور مچھلی کی چٹنی کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔

''مچھلی کی خوشبو کے کیا کہنے!'' سومپونگ کمرے سے باہر چلی آئی۔ اور اپنے پیچھے مچھر دانی کو گراتی آئی۔ مچھر دانی کے سوراخوں میں اُس نے کپڑے کے جو ٹکڑے گھسیڑ رکھے تھے وہ چھوٹے چھوٹے جھنڈوں کی طرح اُڑے۔ سومپونگ نے راسمی کو خوش کرنے کے لیے اس کی جانب اپنی بہترین مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ ایک ایسی مسکراہٹ جسے دیکھ کر غیر ملکی سپاہی اُسے سیامی بلی کہتے تھے۔ اس کی مسکراہٹ نے بوڑھی باورچن پر اس کی بھوک کا پول کھول دیا تھا اور راسمی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''تمھارا کھانا کہاں ہے؟'' راسمی نے غراتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم اپنے لیے چاول زیادہ خریدنا پھر بھول گئی ہو۔ بہت بھاری ہوں گے نا جو تم سے اُٹھ نہیں سکتے تھے؟ انھیں لانے کے لیے تمھیں ٹیکسی چاہیے تھی؟ کاہل، اونہہ!''

''ہائے میری ماں، یہ کسی کو کچھ بھی بھلانے نہیں دیتی! مارکیٹ سے چکوترے ڈھوتے ڈھوتے میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔'' سومپونگ نے آہ و زاری کی۔ ''یہ جو میم ہے یہ چکوترے ہی کیوں کھاتی ہے؟ شاید نازنگیاں اتنی اچھی نہیں ہوتیں!''

راسمی نے سکواڈ کا ڈھانچہ گھمایا جیسے چڑے کا سُوکھا ہوا دستانہ بانس کی سوئی پر گھومتا

ہے۔

''تمہاری عمر میں''، اُس نے کہا،''میں آدھا بیل کندھوں پر اُٹھا لیتی تھی اور کسی نے کبھی میرے منہ سے شکایت کا ایک لفظ نہیں سنا۔ ہاں، میں کام کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ چچا'' اُس نے سومپونگ کی معذرت طلب آنکھوں کو نظرانداز کرتے ہوئے پکے ہوئے سکوڈ مالی کو دے دیے جو سومپونگ کی طرف دیکھتا ہوا اور اسے چڑانے کے لیے اِنھیں اپنے بے دانت مسوڑھوں سے پُر شور انداز میں چوسنے لگا۔

''راسمی، تم تو اب بھی ایسی ہو کہ ایک بیل اٹھا سکو۔'' سومپونگ نے ملایم لہجے میں کہا۔ اُس نے اپنے ذہن میں ایک خیالی سوار کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔''اپنے کام سے غرض رکھو، بس، جھنجھلاتے بڑھے قلی!'' یہ تھا صحیح۔ راسمی خاص طور پر کام کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ چوڑی چکلی اور پُر سکت۔ اس کے بال حیرت انگیز حد تک چمکدار تھے جیسے ایک نایاب پھول جو گھن لگے پرانے درخت پر لگا ہو۔ وہ اپنے بالوں کو سختی سے اپنی چھوٹی گردن پر بنے جُوڑے میں دبا دیتی۔ راسمی کو خوشبوؤں اور شوخ رنگوں سے نفرت تھی۔ اُس کی ساری اَنا کا مرکز اُس کی غیر متزلزل بنیادی اخلاقیات تھی۔ اُس کی جلد سیاہ تھی جو مادام کو پسند نہ تھی۔ مادام سومپونگ کے گورے شمالی حُسن کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ راسمی اس بات سے خار کھاتی تھی۔ سومپونگ کا موجود ہونا ہی اسے تاؤ دلانے کے لیے کافی تھا۔

اُس نے سومپونگ کی طرف دیکھے بنا تیزے سے گھایل ایک سکوڈ پکڑا یا جو ابھی ٹھیک طرح سے نہیں پکا تھا۔''اور ذرا جلدی کرو۔'' اُس نے حکم دیا۔''آج اتنا کام ہے کہ تین لوگ بھی مشکل سے کر پائیں گے۔ کچھ دوست کھانے پر آ رہے ہیں اور میم صاحب اُن بیکار لونڈوں کو سفارت خانے سے بھی نہیں بلا رہی کہ آ کر کھانا ہی لگا دیں۔''

''افسوس۔'' سومپونگ نے سکوڈ سے بھرے ہوئے مُنہ سے کہا۔ کالی مچھلی کی چٹنی اِسے بھینسے کے چڑے کی نسبت تھوڑا سا نرم کر دیتی تھی لیکن بس اتنا ہی۔ راسمی نے ناک چڑھائی۔ ''پچھلی مرتبہ وہ ساری کی ساری شراب پی گئے تھے اور آخر میں باڑ کے نیچے لیٹ کر گانے گا رہے تھے۔''

''اُن میں سے ایک کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔'' سومپونگ نے کہا۔''میم کو چاہیے کہ جب مہمان آئیں تو ہمیں زیادہ تنخواہ دیا کرے کیونکہ کام بھی تو زیادہ ہو جاتا ہے۔''

سومپونگ کو مادام سے بھی تقریباً اتنی ہی نفرت تھی جتنی راسمی سے۔ اُسے مادام کی سفید جلد سے نفرت تھی اور اُن سنہری بالوں سے نفرت تھی جو اتنے خوبصورت لگتے تھے۔ مادام کے پاس تین اور مری ہوئے مادا موں کے گھنگھریالے بال تھے جو بید کے ایک ''مراہوائر'' اپنے بالوں پر رکھ لیتی اور فیشن کی تصویر بن جاتی۔

فرنگی بلا۔ وہ تو اپنی وِگوں میں پوشیدہ بُھوتوں سے بھی خوفزدہ نہیں تھی۔ سومپونگ کبھی کبھی سوچتی کہ شاید مادام نے اُن فرنگی عورتوں کو قتل کر کے اُن کے بال حاصل کیے ہوں۔

سومپونگ بُھوتوں سے خوفزدہ تھی لیکن لڑائی مار کٹائی سے واقف تھی۔ بطخوں اور مرغوں کی لڑائی نہیں بلکہ خاندان میں حقیقی قتل سے بھی واقف تھی۔ اُس کی چچی ایک کاشتکاری میں استعمال ہونے والا چُھرا لے کر اُس کے چچا کی تیسری نوجوان بیوی پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وُہ لاش کو گھسیٹ کر لے جاتے اُس نے اُس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ سوموںگ کو ایسے واقعات یاد آتے تو وہ آرام سے مسکراتی رہتی۔ وہ تو جلانے کے لیے پُوری لاش بھی نہیں تلاش کر سکے تھے۔ ایک کان پورے ایک ہفتے بعد رُوحوں کی درگاہ کے پیچھے سے ملا تھا۔ اب اِس میں دو ہی باتیں ممکن تھیں جن پر صرف ہنسا جا سکتا تھا کہ یا تو رُوحوں نے کان چُرا لیا تھا یا سومپونگ کے خیال میں اسے ان کی بھینٹ چڑھایا گیا تھا! بہر حال، جو بھی ہو، اب تو وہ نوجوان بیوی اگلے جنم میں ایک کان کے بغیر ہی آئے گی۔ عموماً سومپونگ کان کٹی لاش کے بارے میں سوچ کر بے حد خوش ہوا کرتی تھی لیکن آج اُسے اس بات پر بے حد حیرت ہوئی تھی کہ اس نے برآمدے کے کنارے سے جھک کر نیچے کھلے کنول کے اُوپر قے کر دی تھی اور اس کی طبعیت ماندی ہو رہی تھی۔

''گندی'' راسمی نے ناراض ہو کر کہا۔ ''تو میری دی ہوئی اچھی خوراک کا تم یہ حشر کرتی ہو؟ پہاڑی قبیلے کی بکریاں، لاؤ لوگ۔ نہ کھانے کا سلیقہ نہ صاف رہنے کے آداب!''

سومپونگ شرمندہ ہو کر ہنسی۔ وُہ جلدی سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی اور اپنے مُنہ کو ہتھیلی کی پُشت سے صاف کرنے لگی۔ ''میں۔۔۔۔۔۔۔ میں جا کر کپڑے دھوتی ہوں۔ میم نیچے آ کر ابھی اپنی گاف کی قمیض کے لیے گھنٹی بجانے لگی گی۔''

راسمی نے اُسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور اُس کی آنکھوں میں گُھورتی ہوئی کہنے لگی: تم کہیں نہیں جاؤ گی۔'' سومپونگ نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کے زرد رخسار سُرخ ہو گئے۔ راسمی نے دُوسری لڑکی کو مچھردانی میں سے گھسیٹا اور

سونے والی چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''بیٹھو۔ اس کے قدموں میں بیٹھ جاؤ۔'' اُس کا سر راسی کے لباس کے کنارے سے نیچا تھا۔ جیسے راسی اُس کی میم ہو اور اُس جیسی ملازمہ نہ ہو۔ لیکن سومپونگ نے بحث نہ کی۔ وُہ فرش میں گڑ گئی۔

فرش کے تختوں کی درزوں کے نیچے کلونگ کا پانی گھر کے کھمبوں کے ساتھ ٹکراتا تھا۔ یہ پانی اتنا بھاری اور سُست تھا کہ اس پر تیل چپڑے کپڑے کا گمان ہوتا تھا۔ یہ بے حد غلیظ تھا۔ ایسی ہی ایک صبح کو، جب کہ وہ رات کو اچھی طرح سو نہ سکی ہوتی اور صبح سویرے اپنے کمونو میں گھوم رہی ہوتی اور ایک فلاسک سے کافی پیتے ہوئے، جیسے سفاری فلموں میں فلمی ستارے پیتے ہیں، کبھی کبھار اپنے ایک سرخ ناخن سے خشک دودھ کے تیرتے ہوئے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتی۔ راسی کہتی: ''ہاں مادام۔'' تو وہ مچھروں کے انڈوں پر دوائی چھڑک دیتے اور ایک آدھ ٹین باہر نکال لیتے اور اگلے روز سومپونگ کئی اور ٹین پانی میں پھینک دیتی۔ لیکن آج کلونگ کی بُو سے اُس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اُس نے راسی کی
طرف دیکھا اور فیصلہ کیا کہ وہ نرمی سے وقت کاٹے گی۔

''باجی، میں درخواست کرتی ہوں مجھ پر رحم کھاؤ اور اپنا زہریلا غصہ مجھ پر نہ نکالو۔'' وہ ناک میں بول رہی تھی۔ ''پہلے ہی میری طبیعت خراب۔۔۔۔۔۔''

''میں تو زہریلی آواز میں بولوں گی اور زہریلی آنکھوں سے تمھیں گھوروں گی۔'' راسی نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے تمھاری طبیعت کیوں خراب ہو رہی ہے۔'' غصے نے اُسے دیوانی بنا دیا تھا'' کیا میں نے چار بچے نہیں پیدا کیئے؟'' سومپونگ رونے لگی لیکن راسی نے پروا نہ کی۔

''گاؤں سے آئی ہوئی ایک لڑکی جسے میں نے 'بہن' کہا، جس کے لیے ایک فرنگی مادام کے ہاں نوکری تلاش کی جو ایک جنگلی بندریا کو مہینے کے پانچ سو روپے صرف جانگیے دھونے کے دیتی ہے اور مادام سے اُس کی تعریف کی، یہاں تک کہ غیر ملکی زبان میں بھی تعریف کی،'' اس مادام۔۔۔۔۔ راسی سومپونگ کو جانتی، کافی عرصے سے۔ نمبر ایک گڈ گرل ہے۔ نمبر وَن کپڑے دھوتی ہے۔ مادام پیسہ نہیں چُراتی۔ بُرے لڑکوں کو لے کر نہیں آتی۔ گڈ گرل۔۔۔۔۔'' مادام اب تمھیں واپس بھیج دے گی۔ تمھارا کیا خیال ہے اُسے تمھاری ضرورت ہے؟ تمھاری اور تمھارے پھولے ہوئے پیٹ کی اور بعد میں تمھارے چلاتے پلے کی؟ تمھارا کیا خیال ہے کہ ایک

غیر ملکی عورت، جو اپنے خاوند کو صرف اس لیے منہ نہیں دکھا سکتی کہ وُہ بچے پیدا کرنے میں ناکام ہو گئی ہے، تمھیں یہاں بچے دینے کی اجازت دے گی؟''

سومپونگ بآوازِ بلند اپنے آپ پر ترس کھا رہی تھی۔ اُس نے کُچھ کہے بغیر راسمی کے موٹے ٹخنے پکڑ لیے جو ربڑ کی چپلی میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔لیکن راسمی تو سر سے پاؤں تک غصے میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اُس کے ٹخنے بھی ارغوانی ڈنڈے لگ رہے تھے کیوں کہ وُہ بھی اُس کے غصیلے اور سُرخ چہرے کی طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

''راسمی۔۔۔۔۔۔ مادام کو نہ بتانا۔''

''مادام کو۔۔۔۔۔۔ مجھے تو مادام کو نہیں بتانا پڑے گا۔کیا اُس کی اپنی آنکھیں نہیں ہیں؟ بہر حال، یہ ہے کتنے ہفتوں کا؟'' راسمی کا غصہ ان تفتیشی سوالوں کی وجہ سے کچھ دھیما ہوا۔ سومپونگ نے سوچا کہ وہ کتنے عرصے سے ایک بخار آلود حالت میں اپنے سارونگ کو ہر صبح اونچا ہی اونچا باندھتی جاتی تھی؟ اُس نے دس اُنگلیاں کھڑی کر دیں۔ راسمی کو کچھ پتا نہ چلا تھا۔وُہ دوسرے کمرے میں سوتی تھی اور اُسے اُمید ہوتی تھی کہ شاید کبھی اُس کا آوارہ گرد خاوند کسی رات اسے تنہائی میں ملنے کے لیے آنکلے۔وُہ تو صرف تنخواہ کے دن اور کھانے کے وقت آتا تھا، بہت باقاعدگی سے۔ ہاتھ مانگنے کے لیے اور پیٹ خالی۔''دس ہفتے؟ اور بنو، یہ ہے کس کا؟ ہوگا کسی لفنگے کا، مجھے یقین ہے۔ میں نے اکثر تمھیں کام کے دوران اِدھر اُدھر کھسکتے ہوئے دیکھا تھا تمھارا چہرہ کسی نکیائی کی طرح رنگا ہوا ہوتا تھا۔

سومپونگ خاموش رہی۔''تو پھر میں خود ہی پتا چلا لوں گی۔تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں'' راسمی کی آنکھیں ایک ڈبے جتنے چوکور کمرے کو دیکھتی رہیں اور پھر اُس کے تلوں بھرے طاقتور ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کے تعاقب میں گئے۔ایک موٹی اور پاگل گلہری کی طرح وہ سومپونگ کی ذاتی اشیاء کو اِدھر اُدھر بکھیرنے لگی۔اُس نے کچھ چیتھڑے، آدھے کھائے ہوئے مون کیک، چمپُو پھل سستی لپ سٹکیں وغیرہ دن کی روشنی میں پھینک دیں۔ جب وُہ پتلے زیرِ جامے کی طرف آئی اور جب اُس نے غیر ملکی ہاٹ ڈاگ کے ڈبوں کو دیکھا جن پر پی۔ ایکس کی مُہر لگی ہوئی تھی تو اُس کی آنکھیں احساسِ فتح مندی سے چمکنے لگیں۔ وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی، اس طرح کہ سومپونگ کی زیادہ سے زیادہ توہین کر سکے۔

''چنانچہ یہ ہے وہ عظیم راز۔ پی۔ ایکس کے ڈبے۔ امریکی سپاہیوں کی

رکھیل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرنگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک سُرخ بالوں والا عفریت وہی ہے تمھارے پیٹ میں اور اسی لیے تمھیں بتاتے ہوئے شرم آ رہی تھی ۔ اب تمھارے ساتھ کون شادی کرے گا ؟ اور تمھاری ماں دھان کے کھیت میں ایک سُرخ بالوں والے ، آدھے تیتر آدھے بٹیر ، عفریت کے ساتھ کیا کرے گی ؟ تم ایک دوغلے بچے کو کیسے خوراک مہیا کرو گی ؟ تمھیں پتا ہے کہ فرنگی تو دودھ اور قیمے پر پلتے ہیں ۔ ہماری طرح چاولوں پر نہیں ۔ اور سُرخ بالوں والے بچے پاگل ہو جاتے ہیں یا برے نکل آتے ہیں اگر تم اُن کو ٹھیک خوراک نہ دو تو ۔ اب تمھارے آڑے کون آئے گا ، احمق لڑکی ؟ ''

سومپونگ نے رونا بند کر دیا تھا اور اُس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے ۔ وہ کھڑی ہو گئی ۔ راسی کو اُس کے بے فکرے اور پروقار طریقے سے لباس کو سنبھالنے پر بے حد حیرت ہوئی ۔ اُس کا بدن ابھی تک خوبصورت تھا اور دل کو کھینچتا تھا ۔ اُس کی کمر ابھی موٹی نہیں ہوئی تھی ۔ '' باجی تم حق بجانب ہو ، تم سچ کہتی ہو ۔ اب جو کوئی بھی میری مدد کرے گا کم از کم تھائی تو نہیں ہو گا ۔ '' راسی نے اپنی حیرت چھپانے کی کوشش کی اور سومپونگ کو سر اٹھائے گھر کی جانب چلتے دیکھا ۔ اُس نے اُس کو آواز دی : '' اب اگر تم اُدھر جا ہی رہی ہو تو صبح کا اخبار تو لیتی جاؤ ۔ لے جاؤ گی ؟ '' اس پر مطمئن ہو کر ، کہ اُس کے آخری نشانے سے سومپونگ کا وجود تباہ ہو گیا تھا اور حیرت ظاہر کرنے کی وجہ سے اس کی جو تھوڑی سے بے عزتی ہوئی تھی اُس کا بھی ازالہ ہو گیا تھا ، راسی نے اب سکوڈ کی طرف توجہ کی جو جل کر کوئلہ ہو چکا تھا ۔ شاید گاف کے لیے موسم کچھ گرم ہے ۔ کمرے کی ٹھنڈک کے بعد مسز لوسیل فرینکن برگ اب باغیچے کی ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی ۔ اس کی بجائے وہ خطوط بھی تو لکھ سکتی تھی ۔ کافی اور اناناس تو بید کی میز پر پہلے ہی دھرے ہوئے تھے ۔

'' یہاں کی صبحیں خاص طور پر بہت پُر لطف ہیں ۔ جب تک ہوا چلتی رہے خنک اور خوشگوار ۔ '' اُس نے اپنی ماں کو لکھا تھا ۔ اس جدید سائنس کو چلتے پھرتے نیلے بالوں والے معجزہ نے ! کمال کی پھرتیلی عورت ہونے کے باوجود وہ کسی بھی جگہ یا مقام کے جغرافیے اور آب و ہوا کو بنیاد بنا کر فیصلہ کرتی تھی کہ آئندہ کہاں جانا پسند کرے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کون سے موسم میں اور کون سی جگہ ! مسز فرینکن برگ نے تنگ آ کر قلم کو دانتوں سے کاٹا اور چاہا کہ وہ مسز رجنالڈ سی ۔ وِنڈ بلوم کی بجائے سکول کے کسی بچے کو خط لکھ رہی ہوتی ۔ بلکہ کسی کو بھی خط نہ لکھ رہی ہوتی ۔ صرف ایک پیار کرنے والی بیٹی کے خط پڑھ رہی ہوتی ۔ وہ نسلوں کا ادلنا بدلنا چاہتی تھی ۔ وہ اڑتیس کی ہو چکی تھی اور یہ مناسب وقت تھا ۔ یہ وقت تھا نصیحت لینے کی بجائے نصیحت دینے کا ۔ وہ عمر جس میں

کسی بچی کو سجایا یا سنوارا جاتا ہے نہ یہ کہ خود بن ٹھن کر گڑیا بنی پھرے۔ '' جانی، اس سکرٹ میں تم جچ نہیں رہی ہو! '' یہ وقت تھا تخلیقی گھریلو سرگرمیوں کا۔ ایک ایسے بچے کے ساتھ، جو بہت تیز اور پیارا ہو، سنہری بالوں والا اور گریگ کی طرح نیلی آنکھوں والا، انگلی کے ساتھ تصویریں اور کاغذ کو کاٹ کر چیزیں بنانے کا۔ بچہ جس کی عمر اور جنس کا پتہ نہ تھا، اپنا پھول سا چہرہ اوپر اٹھائے گا تاکہ اس کی آنکھوں سے پیار اور علم اور راہنمائی حاصل کر سکے۔ جیسے وہ دھوپ بھی ہو اور برسنے والا بادل بھی۔

مسز فرینکلن برگ نے ایک مچھر کو ہاتھ رسید کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ پر رحم کھانے کے جذبے کا بے رحمی سے گلا گھونٹ دیا۔ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اڑتیس کی ہے۔ جیسا کہ اس کا خاوند اکثر کہا کرتا تھا: '' جانی، کسی کو خیال بھی نہیں آ سکتا کہ تم تقریباً چالیس کی ہو چکی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھارا بدن تو کسی نوخیز لڑکی ایسا ہے۔ '' اور یہ سچ تھا۔ اُس کے گھنگریالے سنہرے بال تھے اور لولیتا ایسی آگے کو اُٹھی ہوئی چھاتیاں جو کسی کنواری کی لگتی تھیں اور اُس کے خاوند کو ایک خوشگوار لذت سے ہمکنار کرتی تھیں کہ کہیں وہ قانون کی گرفت میں نہ آ جائے۔ وہ بہ آسانی نوخیز لڑکیوں والے کپڑے پہن سکتی تھی۔ جو اس کے سراپے پر سجتے تھے۔ لیکن وُہ اپنے لیے ایسے کپڑے خریدتے تنگ آ گئی تھی۔ پھر ہمیشہ ایک طنز تو موجود رہتا تھا: '' ظاہر ہے بچوں کی پیدائش سے بدن کی بناوٹ خراب ہو جاتی ہے۔ میں تو مائیکل اور ڈیوڈ اور سوزن اور گرانٹ اور آرون سے پیشتر ایک تیر کی طرح تھی لیکن کیرن نے تو میرا ناس مار دیا۔۔۔۔۔۔ ''

مسز فرینکلن برگ نے تیزی سے اپنا دُھوپ کا چشمہ پہن لیا۔ وہ پھر تیوریاں چڑھا رہی تھی۔ جلد ہی چہرے پر جھریاں ہوں گی اور اگر آپ کا خاوند نوجوان اور ایک سنہری کھلاڑی ہو تو جھریوں سے بچنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے گریگ فرینکلن برگ اتنا عقلمند نہ ہو جتنا خوبصورت تھا لیکن وُہ اُس سے محبت کرتی
تھی۔ کاش وہ اسے اپنی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر سکے۔

متبنیٰ بنانے والی سوسائٹی کو اُنھوں نے دو برس پیشتر درخواست دی تھی اور تب اُنھیں بتایا گیا تھا کہ اُن کی عمریں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ ہزار بار اُس نے اُس راستے کے بارے میں سوچا تھا جو گریگ کے ذہن میں تھا۔ آخری موقع، آخری ممکنہ صورت، اس سے پہلے کہ سوسائٹی

کی انتظامیہ اپنے حربے استعمال کر کے اُن کی درخواست اور امیدوں کو ہمیشہ کے لیے ہڑپ کر جائے۔

گریگ نے اس بارے میں بات کی تھی، ذرا شرما کر۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا اینگلو سیکین پس منظر اُس کے لیے کتنا اہم ہے۔ جب بھی وہ اس پر غور کرتی تھی اُسے قدرت کے ایک ہی خیال کو کئی طریقوں سے پیش کرنے سے خوف آتا تھا اور وہ ڈرتی تھی۔ وہ کبھی ان جذبات پر قابو نہ پاسکتی تھی۔ مشرق میں چار سالہ قیام سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے زیادہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اُبلی ہوئی مکی اور تلے ہوئے چاول اپنی جگہ ٹھیک تھے لیکن چینیوں کو لانڈریوں اور حبشیوں کو جاز کے بینڈوں میں یا اُچھل کر حاضر ہونے کے لیے ایسی گھنٹیوں کے قریب ہونا چاہیے جن پر ''خدمت گزار'' لکھا ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے بچے کو ہمیشہ ایک کاکیشین کے روپ میں دیکھا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ تجویز کم بُری لگنے لگی۔ کسی مقامی تھائی عورت کی مُہرے سے زیادہ مغربی لگے۔ ایسی عورت کا بچہ گود لے لیا جائے۔ ظاہر ہے اس کے تمام اخراجات وہ برداشت کریں گے۔ اُسے بہترین طبی سہولتیں مہیا کریں گے اور وہ بچے کو کیسی شاندار زندگی پیش کریں گے! تعلیم، مواقع، سیریں، سَمر کیمپ۔ اور جب گریگ کو اپنے ملک واپس بھیجا جائے گا تو وُہ بڑی خوشی سے بچے کو اُن تمام چیزوں سے بچالے جائے گی جن سے وُہ خود بھی بچنا چاہتی ہوگی۔ وُہ اُسے ایک فرنگی کی طرح پال سکتے تھے۔ یہ ایک چیلنج ہوگا۔

یہ منصوبہ قابلِ تعریف ہونے کے علاوہ سُودمند بھی تھا، کیونکہ وہ بچہ اُن دراڑوں کو ملائے گا جو اُن دونوں کی شادی میں پڑ چکی تھیں۔ اُس کی ساری دولت اور گریگ کے کھلاڑیوں والے خوشگوار مزاج کے باوجود لگتا تھا اُن کی رفاقت دُوری میں بدل جائے گی۔ اُس نے پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔

''میں نے لڑکیوں کے بارے میں سُنا ہے۔ مقامی لڑکیوں کے بارے میں۔ جو بچے بیچتی ہیں۔'' گریگ نے کہا تھا۔ اُسے بے پناہ پسینہ آیا ہوا تھا۔

''بچے؟ بچے فروخت کرتی ہیں؟ نہیں گریگ یقیناً ایسا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔ کون ایسا کرسکتا ہے؟ ایک ایشیائی بھی اتنا تو نہیں گر سکتا۔ اور تھائی تو اپنے بچوں کو بے حد پیار کرتے ہیں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ بہت اچھی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ وہ

اُنھیں فروخت کرتی ہیں اور صرف ایک ہزار روپے میں ۔قسمت ساتھ دے تو صرف بیس ڈالر میں ،اگر وُہ مالی پریشانیوں میں مُبتلا ہوں تو۔''

''نہیں گریگ، میں اس سلسلے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔'' لیکن دوبارہ وہی موضوع چھڑ جاتا:''آخر نفسیات دان بھی تو ہمیشہ یہ ثابت کرتے رہے ہیں کہ ساز گار ماحول کسی ورثے میں ملے ہوئے برے کردار پر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے لیکن کیا تم ایک بھورے بچے کے لیے بھی ویسا ہی محسوس کرو گے جس کی آنکھیں عجیب سی ترچھی ہوں؟ کیا تم ایسا کرسکو گے؟ کیا تم ایسا کرسکو گے؟''

مسز فرینکلن برگ کو تھائیوں کی اِس عادت سے چڑ تھی کہ وُہ اُس پر نظریں جمائے اِدھر اُدھر کھڑے رہتے تھے جب تک کہ وہ اُنھیں بولنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ وہ اِس بات سے آگاہ تھی کہ سومپونگ اُس کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔ جب لڑکی کو پتہ چلتا کہ اُسے دیکھ لیا گیا ہے تو وہ فرش پر بیٹھ کر جھک جاتی۔

''کیا ہے؟'' مسز فرینکلن برگ جتنی نرمی سے پوچھ سکتی تھی پوچھتی۔ دنیا میں اور کہیں ایسے لوگ نہ تھے جن پر تم اپنا غصہ نکالو پھر پُشت پر تھپکی دے دو، ایک پیالی کافی پلا دو تو وہ سب کچھ بھلا دیں گے۔ وہ جلد ہی مسکرانے لگتے لیکن بُھولتے نہیں تھے۔''مزید ادھار چاہیے یا رشتے داروں کو دیکھنے جانے کے لیے ایک دن کی چھٹی چاہیے؟''

لگتا تھا نوکروں کے رشتے داروں کی قطاریں ہیں جو موت کے دروازے پر کھڑے ہیں اور چاول کی قیمت دن بدن بڑھتی چلی رہی تھی۔

سومپونگ نے سسکیاں بھرتے ہوئے ،لفظوں کی بوچھاڑ میں، اپنی رام کہانی سنائی تاکہ مادام پر بہت اثر ہو۔ اُس نے کہانی کا اختتام ایک ماہرانہ تخلیقی انداز میں یہ کہتے ہوئے کیا کہ وُہ گھر واپس نہیں جائے گی، اُس کا باپ اُسے مار ڈالے گا۔ اگر وہ بچے کو نہ رکھ سکی تو اپنے آپ کو مار ڈالے گی۔ یہ ایک غیر ملکی بچہ تھا۔ اگر مادام نے مدد نہ کی تو وہ شرم کے مارے مرجائے گی۔ پھر وہ اس کے قدموں میں یوں جھکی گویا فرش چوم رہی ہے۔

کوئی حالت قدم بوسی سے زیادہ ذلیل نہیں۔ یہ بُدھ لاماؤں، محترم والدین اور شاہی خاندان کے افراد کے سامنے کی جاتی ہے۔ ملائیں اِسے نہایت نفیس طریقے سے پیش کرتی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے پچاس کیمروں کے سامنے، مقدس بتوں کے سامنے اور اجداد کے مقابر کے

سامنے اور پوری قوم اُن کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے اور سراہتی ہے کیونکہ گھٹنوں کے بل چلنا اور خاک میں سانس لینا اچھی بھلی مشقت ہے جب کہ آپ نے بدن سے لپٹا ہوا ایک سارونگ بھی پہن رکھا ہو اور جب ایسا کرنے والے کو کوہان بھی کوئی اچھا منظر نہ پیش کر رہا ہو۔ قصہ مختصر، بجائے اس کے کہ آپ ایسا کر رہے ہوں بہتر ہے کوئی اور آپ کے سامنے ایسا کر رہا ہو۔ مسز فرینکن برگ نے اناناس کی پلیٹ اور آدھے لکھے خط کی طرف سومپونگ کی کسی ہوئی چھوٹی پشت کے اوپر سے دیکھا اور تیزی سے سوچا: دوغلا۔۔۔۔۔ایک دوغلا بچہ۔۔۔۔۔لیکن کس کا؟ ایک جواب جھٹ پٹ آ گیا لیکن اُس نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ جب سومپونگ پہلی بار آئی تھی تو گریگ، جو کسی خوبصورت بدن کو سات پردوں میں سے بھی دیکھ لیتا تھا، فوراً اس کے پہلے خوبصورت چہرے، اُس کے شاندار بالوں کی طرح تھے۔ اور اُس کا سر تو ایسے تھا جیسے نازک ڈنٹھل پر ایک خوبصورت پھول۔ گریگ شاعر تو نہیں تھا لیکن ان میں سے کچھ باتیں اُس نے کہی تھیں اور بہت ساری باتیں صرف سوچی تھیں اور بار ہا، جب وہ ہفتے کے اختتام پر گاف کھیلنے جاتی، گریگ پر کام کا بوجھ پڑ جاتا تو وہ بڑی بے غرضی اور خوش مزاجی سے اُسے خدا حافظ کہہ کر گھر ہی ٹھہرا رہتا۔ وُہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا سلسلہ ہے۔

''یہ بچہ کس کا ہے؟'' اُس نے تھائی میں سرگوشی کی اور اسی وقت اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر اُس کے چہرے کو اپنی طرف کیا۔ کھلی ہوئی، پگھلتی سیاہ آنکھیں جو اس کی طرف اور شرمندگی سے دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے سوچا جیسے اس نے جواب پڑھا ہے۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر چندھیا گئی تھیں لیکن چاند ایسا زردحسن قائم تھا۔

''نہیں۔'' مسز فرینکن برگ نے کہا۔ مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔ تم جاؤ۔

''اچھا مادام۔۔۔۔۔شکریہ مادام۔۔۔۔۔شکریہ'' سومپونگ باورچی خانے میں واپس چلی گئی۔ اُسے اپنا آخری ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اس دھمکی کی کہ وہ الماری میں رکھی ساری سپرین کی گولیاں نگل کر خودکشی کر لے گی۔

مسز فرینکن برگ سُن ہوگئی تھی لیکن وُہ ایک غیر معمولی عورت تھی، اپنی ماں کی طرح۔ وُہ ایک مثالی بیوی کا کردار ادا کرے گی۔ وُہ کبھی اپنے شک کا اظہار نہیں کرے گی اور سب کُچھ برداشت کرتے ہوئے بچے کو گود لے لینے کی تجویز پیش کرے گی۔ یہ تہیہ کر کے اُس نے سومپونگ کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

راسمی نے باغیچے کے کونے سے جھانکا اور اُسے ایک ایسا منظر آیا جس نے اسے غصے سے بھر دیا۔ مادام اُس رومال سے، جو اس نے ابھی کل ہی اِستری کیا تھا، کپڑے دھونے والی لڑکی کے آنسو پونچھ رہی تھی۔فرنگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بے عقل۔۔۔۔۔راسمی نے دونوں ہاتھ فضا میں بُلند، کیے اور پھر نیچے گرا دیے۔ اُس کے ذاتی چہرے کو اتنا ہی نقصان پہنچا تھا استری کرتے ہوئے جتنا کہ مادام کو ناک پونچھتے ہوئے پہنچا تھا۔لیکن وہ مادام سے یہ توقع نہیں رکھتی تھی کہ وُہ اس بات کو سمجھ سکے۔ مالی، جو کہ بوڑھا تھا اور کسی بچے کی طرح سنسنی خیزی کا جویا تھا، بڑا اچھا سامع تھا۔اس کے سامنے ساری حیریت انگیز تفصیلات دہراتے ہوئے اُسے بڑا اطمینان ہوا۔

حیرت در حیرت۔۔۔۔۔سومیونگ کو پورے ایک مہینے کی چھٹی مل رہی تھی۔ وہ وزنی پھل نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ نہ ہی اُسے دھلائی کے کپڑوں کی ٹوکری اُٹھانے کی اجازت تھی۔ وہ فرش کی پالش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ففتھ فیلڈ ہسپتال سے بڑی باقاعدگی سے اپنا طبی معائنہ کرواتے رہنا تھا۔ وہ وٹامن کھائے گی ڈبہ بند اورنج جوس پیے گی۔۔۔۔۔طاقت بڑھانے والی خوراک کھائے گی۔

''چھوئے، جہاں ہم کام کر رہے ہیں وہ پاگل خانہ ہے۔نہیں!''

دن قریب آتا جا رہا تھا۔سومیونگ اپنے کمرے میں نئے گدے والے بستر پر بیٹھی تھی اور اپنے دانتوں کے دھبوں کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔نسل پروری کی اپنی کچھ مشکلات بھی تھیں۔ مادام اس بات پر خوش نہیں ہوگی کہ وُہ اب بھی چھالیہ چبائے جا رہی تھی۔ مادام نے اُسے ایک لیکچر بھی دیا تھا جس میں کسی غیر زبان کے محاورے تھے لیکن وُہ تھائی زبان میں ٹھیک طرح سے منتقل نہ ہو سکے لیکن اُس نے سومیونگ کو ایک چھوٹا سا بُرش اور سفید شے کی ایک ٹیوب دی تھی۔ بُرش تو اُس کے بالوں میں چھلے بنانے کے کام آ سکتا تھا لیکن سفید شے اتنی بدمزہ تھی کہ چاولوں پر بھی نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ اُس نے یہ ٹیوب مالی کو دے دی جس نے اپنے ٹینس شوز پر لگا کر اُنہیں چمکا لیا۔

پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ کُھلی چھت والی آخری کار بھی پھولوں کی کیاری میں بجری بکھیرتی ہوئی جا چکی تھی۔مسز فرینکن برگ نے ٹھوکر مار کر اپنے سینڈل اُتار دیے اور آخری سگریٹ پینے لگی۔

''اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' گریگ نے کہا اور اُس کے سامنے ایک شاہانہ کُرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہ میری زندگی کا سب سے فائدہ مند تجربہ ہے۔'' اس کی بیوی بولی۔'' بچے کو بڑھتے ہوئے دیکھنا، جیسے میں خود اُمید سے ہوں۔''

''اچھی بات یہ ہے کہ ماں کا رنگ اتنا صاف ہے۔ پھر بچہ بھی دوغلا ہے۔ اسے ہمارے ماحول میں ڈھلتے دیر نہیں لگے گی۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔یعنی جب ہم وطن واپس جائیں گے۔ میرا خیال ہے تم نے پوری طرح چھان پھٹک کر لی ہوگی کہ بچے کا باپ امریکی ہے؟'' وُہ ذرا ہچکچا رہا تھا۔

''ہاں۔'' اُس نے کہا'' مجھے پورا یقین ہے۔''

''کیا میں نے تمھیں بتایا تھا''، اُس نے اپنے گلاس سے مخاطب ہو کر بعجلت کہا،'' میں اس بات کا پورا اطمینان چاہتا تھا کہ کہیں کوئی اڑچن نہیں ہو لہٰذا میں سو میونگ کو اپنے قانونی مشیر کے پاس لے گیا تھا جہاں اُس سے بچے کو گود لینے کے کاغذات پر انگوٹھے لگوا لیے گئے ہیں۔ اب معاملہ پکا ہے۔''

''گریگ مجھے خوشی ہے کہ'' تم نے ایسا کیا۔'' اُس نے کہا۔'' اخلاقیات ایک عیاشی ہے، غریب طبقہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین ہے اگر کوئی زیادہ مول لگاتا تو وہ یہ بچہ اسے بھی دے سکتی تھی۔''

''لہٰذا اسی خوشی میں ایک جام فرینکن برگ کی کروڑوں کی دولت کے وارث کے لیے۔۔۔۔۔۔'' اُس نے مذاق کرتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ اُٹھا کر غوطہ خوروں والی گھڑی پر سے وقت دیکھا۔'' صبح کے تین بج رہے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا وہ جانے کا نام نہیں لیں گے۔ یکا یک ہم سب کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ وہ چٹپٹی خبریں سننا چاہتے ہیں۔ اِس سے تمھارا دماغ نہیں خراب ہونا چاہیے۔ اور خواہ مخواہ مجھ پر مت چڑھ دوڑنا۔۔۔۔کہیں تمھیں حمل کا دورہ پڑ جائے اور اپنے تکیے اپنے لبادے میں چھپاتی پھرو۔ بہر حال، اے ماں بننے والی خاتون، تمھیں اس وقت آرام کرنا چاہیے۔'' ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وُہ سیڑھیوں پر چڑھتے گئے۔

بعد میں، تاریکی میں، دوبارہ تنہا، وہ نیم خوابیدہ ذاتی خوابوں سے ہم آغوش ہوتے رہے۔'' ہم فرق واضح کریں گے۔'' مشرقی شہزادی کو چیانگ منڈیرین طرز کے کپڑے پہنائیں گے۔'' مسز فرینکن برگ نے سوچا۔'' میں تو اس وقت اُس کو گریجویشن کے موقع پر دیکھ رہی ہوں۔ کہا جاتا ہے ملواں خون رکھنے والے بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ وہ ان طالب علموں میں

سے ہوگی جو صرف گریڈ ''اے'' لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔میری بیٹی۔۔۔۔۔میری اس لیے کہ یہ خیال جو میرا ہے۔''

''میں اُسے تیرنا، نشانے بازی اور سکی کرنا سکھاؤں گا۔'' گریگ سوچ رہا تھا۔ اُس کا باپ کون ہوسکتا ہے؟ سومیونگ تو ایک ننھا سا سرخ آڑو تھی لیکن باپ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ اس نے کیا گنوا دیا ہے۔ ''میرا بیٹا'' گریگ نے سوچا۔

اُبلتی ہوئی گرمیاں کسی تو تکارے کے بغیر گزر گئیں۔ گاف کھیلنے والوں میں تو وہ ایک زندہ داستان کی طرح تھے۔ اُن کے خوبصورت دوست ایک دوسرے کو بتاتے کہ فرینکن برگ بہت پیارے لوگ ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ بھی بہت حسین ہے۔ خصوصاً مسز فرینکن برگ۔ اُس میں کوئی خرابی تھی تو بس یہ کہ وہ رنگ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس تھی۔ فرینکن برگ اب ایک دوسرے کو ''ماں'' اور ''باپ'' کہہ کر بلاتے اور یہ بہت پُر لطف بات تھی۔

سومیونگ ہمیشہ اپنے ہونٹوں پر سُرخی اور زرد چہرے پر چاولوں کا پاؤڈر لگا کر فوجی ہسپتال میں معائنہ کروانے کے لیے جاتی۔ راسمی دروازے پر جھک کر بڑی حقارت سے یہ سب کچھ دیکھتی۔ اب بڑے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے آئینے کا کام نہیں دیتے تھے بلکہ اُس کے پاس تو ایک پورا گول آئینہ تھا، دستے اور گلاب کے پھُولوں والا۔ مادام سومیونگ کو اپنے ہمراہ عیسائیوں کے گرجے بھی لے گئی تھی اور وہاں بیٹھنے، جھُکنے، اونگھنے، سونے اور ناک نہ سڑکنے کی بات نہیں تھی کہ مادام ناراض ہوگی، بلکہ وہ ایک قسم کی مارکیٹ تھی جہاں مادا میں سٹالوں کے پیچھے کھڑی چینی بستیوں کے عام بڑھے خوانچہ فروشوں کی طرح فضول چیزیں فروخت کر رہی تھیں۔

اِس آئینے کے لیے مادام نے دس روپے ادا کیے تھے۔ اس رقم میں تو پندرہ دنوں کے چاول خریدے جاسکتے تھے۔

بے صبری سے مادام نے اپنی بیوک کا ہان بجایا۔ ''راسمی، میرے جوتے۔۔۔۔۔۔ فوراً میرے جوتے لے کر آؤ۔ مادام میرا انتظار کر رہی ہیں۔'' سومیونگ نے کہا۔ اُس نے لپ سٹک واپس رکھتے ہوئے راسمی کی طرف دیکھا۔ ''مادام نے کہا تھا میں جھکا نہ کروں۔'' ''مادام نے کہا۔۔۔۔۔۔۔مادام نے کہا۔۔۔۔۔۔'' راسمی نے نقل اُتاری۔ اُس نے اونچی ایڑی کے ایک جُوتے کو وحشی پن سے ٹھوکر لگا کر فرش پر پھینکا۔ ''میں تمھیں بتا رہی ہوں کہ ایک بار جب تم بچہ پیدا کرلوگی،'' اُس نے بدتمیزی سے اُس کے پیٹ میں اُنگلی چبھوئی، ''تم تم دھلائی کرنے

واپس آ جاؤ گی۔ اس بھلاوے نہ رہنا، پھر وہ تمھاری شکل دیکھنا بھی پسند نہ کریں گے جب کہ وُہ اُسے ایک غیر ملکی کی طرح پال رہے ہونگے۔ تم کس قسم کی عورت ہو کہ اپنا بچہ فروخت کر رہی ہو؟''

''میں نے اپنا بچہ فروخت نہیں کیا۔'' سومپونگ نے احتجاج کیا۔ ''میں چاہتی ہوں اسے اچھی زندگی میسر آئے۔ ویسی زندگی جیسی اُس کے باپ کی خواہش تھی۔ اُس کا باپ امریکی فوج میں ایک بڑا افسر تھا۔''

''ہونہہ۔'' راسی نے غصے سے کہا ''اس کا شاندار فرنگی باپ! میرا خیال ہے تم تو اُسے دوبارہ پہچان بھی نہیں سکتیں کہ تمھارے والا سُرخ بالوں والا گوریلا۔۔۔۔۔شراب کی بو چھوڑتا گوریلا۔۔۔۔۔کون سا اس کا باپ تھا؟''

راسی نے سومپونگ کو بہت برداشت کیا تھا۔ کئی ماہ سے ان کے درمیان کھچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ سومپونگ کے بھاری وجود نے اُسے بہت سُست اور آرام طلب بنا دیا تھا۔ وُہ خاصی موٹی ہوگئی تھی لیکن آخری طنز نے اُس کی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا اور وُہ پھٹ پڑی۔

''تم دیکھ لوگی۔'' اُس نے کہا۔

اُس نے گتے کے بکس میں ہاتھ ڈال کر چیزوں کو اُلٹنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے خزانے یہیں رکھتی تھی: چوری کیے ہوئے اور اِدھر اُدھر سے اُٹھائے ہوئے زیر جامے۔۔۔۔۔راسی نے ان میں اپنا بلاوز پہچان لیا اور جھپٹ کر اسے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اُس نے ایک مُڑی تُڑی تصویر نکالی اور راسی کے سامنے فاتحانہ انداز میں لہرائی: ''یہ ہے۔ یہ ہے وہ تصویر جو اُس نے مجھے دی تھی۔ میں پُورے پانچ دن اِس کے ساتھ رہی تھی اور وُہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔''

راسی نے ابھی صرف وردی کے بٹن، سینے کی جیب پر چسپاں نام کی چٹ، جنگل میں پہننے والی ٹوپی دیکھی تھی کہ سومپونگ نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور تصویر فرش پر گر گئی۔ وُہ تیز تیز سانس لے رہی تھی اور تڑپ رہی تھی جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اُس کی کوکھ کو تلوار سے کاٹ رہا ہو۔

''میرا خیال ہے۔۔۔۔۔کہ یہ شروع ہوگیا ہے۔۔۔۔۔ہائے
راسی۔۔۔۔۔۔ماں۔۔۔۔۔میری مدد کرو۔۔۔۔۔۔مجھے پتا ہے میں مرجاؤں گی۔''

مادام اور راسی نے چیختی چلاتی لڑکی کو باقاعدہ اُٹھا کر بیوک کی پچھلی سیٹ میں ڈالا۔ مادام کے اس نظریے پر، کہ مقامی عورتیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی ہیں اور جوڑے جن لیتی ہیں اور پھر اُنھیں کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر پھر سے گنے کی فصل کاٹنے چلی جاتی ہیں، کاری ضرب لگی

تھی ۔لیکن سو مپو نگ بھی تو نو ماہ ڈنلپ کے نرم تکیوں اور پی ایکس کے وٹا منوں کی وجہ سے ذرا نازک ہوگئی تھی ۔ راسمی نے پسینے سے بھیگے ہوئے دونوں سفید چہروں کونفرت بھری نظروں سے دیکھا ۔ وُہ ایک اُبلے ہوئے مُرغ کی طرح سفید اور بغیر خون کے لگ رہے تھے ۔ پتہ نہیں یہ ہسپتال تک بھی پہنچتے ہیں یا نہیں ۔ اُس نے سوچا ۔

مالی سرپٹ دوڑتا ہوا آیا اور پھاٹک کھول دیا اور بیوک دُھول اُڑاتی نکل گئی ۔

انتظار کے لمحے ختم ہو چکے تھے ۔ دونوں حاملہ عورتیں، دونوں بری طرح خوفزدہ ڈیلوری رُوم کی جانب جا رہی تھیں ۔

راسمی کو کچھ یاد آ گیا ۔ وُہ سومپونگ کے کمرے میں واپس آ گئی اور اُس جگہ سے وُہ تصویر اُٹھالی جہاں سومپونگ نے اُسے پھینکا تھا ۔ وہ بہت دیر تک آنکھوں پر زور ڈالتے ہوئے سومپونگ کے محبوب کی تصویر دیکھتی رہی ۔ مادام کے بچے کے باپ کی تصویر! کسی لگاوٹ کے بغیر ایک نوجوان نیگرو جی آئی کا خوش باش سیاہ چہرہ اُس کی جانب مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن راسمی اُس کا چہرہ نہیں دیکھ رہی تھی ۔ وُہ مادام کا چہرہ دیکھ رہی تھی!

نگوئن سانگ
(جمہوریہ ویت نام)

ہاتھی کے دانت کی کنگھی

چاندنی میں نہایا ہوا جھونپڑا سرکنڈوں کے میدان کے وسط میں پوشیدہ تھا، مین گرو کے چھدرے درختوں کے درمیان جو چڑھتے پانی کے راستے میں تھے۔ یہ ایک ایسی چوکی تھی جو رابطے کے لیے بے حد اہم تھی، چھوٹی مگر لوگوں سے بھری ہوئی۔ چونکہ یہاں سے چل نکلنے کے لیے ہمیں اپنی باری کا انتظار کرنا تھا، ہم آرام کر رہے تھے۔ لکڑی کے تختوں پر آلتی پالتی مارے ہم اپنے آپ کو قید محسوس کر رہے تھے۔ وقت گزاری کے لیے ہم ایک دوسرے کو کہانیاں سنانے لگے۔ مجھے وُہ بوڑھا کامریڈ نہیں بھولتا جو کمال کا داستان گو تھا۔ مزاحمت کے بارے میں اُس کے کچھ ناواجب قسم کے لطیفے بھی ہمیں ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیتے۔ جب وہ شروع کرتا تو ہمیشہ مسکراتا اور ذرا مزاحیہ شکل بناتا لیکن اُس رات معاملہ کچھ اور تھا۔ اُس نے گفتگو کرنے پر اصرار کیا اور جب سب لوگ متفق ہو گئے تو وہ خاصی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر بالکل بے حس و حرکت بیٹھ کر آس پاس پھیلے پانیوں کی وسعت کو دیکھنے لگا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی انتہائی سنجیدہ بات کہنے والا ہے چنانچہ ہم نے فقرے بازی بند کر دی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور مین گرو کے درختوں پر لہریں سر پٹخ رہی تھیں۔ جھونپڑا ایک کشتی کی طرح جُھولتا تھا۔ چند بگلوں نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور پرواز کر گئے اور کچھ بے چینی سے اِدھر اُدھر ہو کر پھر بیٹھ گئے۔ لہریں اور تیز ہوا اسے گزرے ہوئے واقعات کی یاد دلا رہی تھیں۔ اُس نے جیسے دور کی آوازیں

سننے کے لیے اپنے کان اُدھر لگا دیے۔ سرگوشیوں میں اُس نے اپنی کہانی شروع کی۔ وہ ہم سے منہ موڑ کر چمکتے ستاروں اور افق کو دیکھنے لگا۔

وہ کہانی ایک برس پہلے کی تھی لیکن میں جب بھی اُسے یاد کرتا ہوں تو مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ابھی ابھی ایک خواب سے باہر آیا ہوں۔ اُس روز میں نے ایم۔ جی۔ چوکی سے ڈی۔ اے چوکی تک سفر کیا تھا۔ جونہی موٹر بوٹ ساحل سے جُدا ہوئی ہم میں سے ہر ایک یہ جاننے کا خواش مند تھا کہ اِسے کون چلا رہا ہے۔ یہ صرف تجسس کی وجہ سے نہیں تھا۔ روانگی سے پیشتر رابطہ چوکی کے سربراہ نے ہمیں بتایا تھا کہ ہم ایک طویل اور خطرناک سفر پر جا رہے ہیں اور ہمیں کشتی کے ذریعے جانا ہوگا اور پھر کُچھ فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا۔ پانی کے اوپر ہم ہیلی کاپٹروں کی نظر میں آ سکتے تھے اور زمین پر کمانڈوز کا سامنا ہوسکتا تھا۔ اگر ہیلی کاپٹر ہمارے سروں پر چکر لگانے لگیں تو ہمیں پُرسکون رہنے کا حکم دیا گیا تھا اور ہدایت تھی کہ ہم کشتی چلانے والے کا ہر حکم مانیں۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری قسمت اُس کے ہاتھوں میں تھی اور ظاہر ہے اسی لیے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ لیکن تاریکی کی وجہ سے میں صرف اتنا جان سکا کہ وُہ ایک دبلی سی نوجوان لڑکی ہے جس نے کندھوں پر ایک امریکی کاربین ڈال رکھی ہے اور اُس کے گلے میں ایک رومال ہے۔ وہ بہت صاف ستھرے مزاج کی لگ رہی تھی۔ میں نے لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ اس چوکی کی رابطہ لڑکی بہت ہوشیار ہے۔ ایک روز وُہ کچھ فوجیوں کو راستہ دکھا رہی تھی۔ ایک دریا عبور کرنے سے پیشتر اُس نے اُنھیں کنارے سے دُور دھان کے ایک کھیت میں رُکنے کے لیے کہا۔ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس علاقے کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ ایک جال میں پھنس گئی ہے لیکن اُس نے حواس قابو میں رکھے اور اپنے ساتھی کو کہنے لگی:

''سب کچھ ٹھیک ہے تم جاؤ اور مسافروں کو یہاں لے آؤ۔ میں دوسرے کنارے سے کشتی لے کر آتی ہوں۔''

اُس نے بلند آواز میں بات کی تاکہ دشمن سن لے۔ یُوں اُس نے ایک خفیہ پیغام دے دیا۔ اُس کے ساتھی نے آرام سے جا کر مسافروں کو ایک اور جگہ سے دریا عبور کروا دیا جو یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اُس نے خود دو دستی بم وہاں رکھے اور بحفاظت دریا عبور کر گئی۔ اس دوران دشمن انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں اور اُس کے شکار بنیں۔ وقت گزرتا گیا اور کچھ نہ ہوا۔ کمانڈوز جان گئے کہ اُن کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور وُہ ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے

اپنی چھاؤنی کی طرف لوٹ گئے ۔ راستے میں وہ دستی بموں پر سے گزرے اور اُن کے پھٹنے سے کئی مارے گئے ۔ بعد میں جب لوگ یہ کہانی سناتے تھے تو کہتے تھے کہ لڑکی میں سُونگھنے کی حس بہت تیز تھی اور یوں وہ دشمن کا پتا چلا لیتی تھی ۔ اور امریکیوں اور کٹھ پتلیوں کے درمیان بھی فرق جان جاتی تھی ۔

اگر وہی لڑکی، جو وہاں رابطے پر مامور تھی، اِس کشتی کو چلا رہی ہے تو پھر فکر کی کوئی گنجائش نہیں ۔ میں نے سوچا ''اِس چوکی پر کتنی عورتیں کام کر رہی ہیں ؟'' میں نے دریافت کیا ۔

''صرف دو ۔ ایک میں ہوں اور دوسری کھانا پکانے والی ۔''

یہ وہی تھی ۔ اس میں کوئی شک نہ تھا اور میری فکر ختم ہوگئی اُس کی آواز سُن کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اٹھارہ کی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ بیس برس کی ۔ میں اُسے پسند کرنے لگا تھا اور اُس سے مزید سوال پوچھنا چاہتا تھا ۔ وُہ کشتی کو سٹارٹ کرنے والی مشین میں منہمک تھی ۔ میں نے ارادہ ترک کر دیا ۔ اُس نے ڈوری کو تھالی کے گرد لپیٹا اور سیدھی کھڑی ہو کر ایک نزدیکی کشتی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی: ''میں پہلے چلتی ہوں، ٹھیک ہے؟''

''بہت خوب ۔۔۔۔۔۔ اور سفر مبارک ہو ۔'' دوسری کشتی کے رابطہ مرد نے کہا ۔

کچھ لوگ اُسے بہن ہائے (سب سے بڑی) کہتے تھے اور کُچھ بہن اُت (سب سے چھوٹی) ۔ وُہ اُن کو بڑے مزیدار جواب دیتی تھی اور اُنھیں ''چھوٹے بھائی'' کہہ کر پکارتی تھی ۔ پھر اُس نے بے حد نرم لہجے میں ہم سے کہا کہ ہم اہم چیزوں کو اپنی جیبوں میں سنبھال لیں یا الگ الگ پارسلوں میں تاکہ ہیلی کاپٹروں کے حملے یا کمانڈوز کے حملہ کرنے کی صورت میں نقصان کم سے کم ہو ۔

''اِن حادثات کے بارے میں اُس نے ہمیں بڑے پیار اور نرمی سے خبردار کیا ۔ یقین کیجیے سٹیشن ماسٹر ایسا نہیں کیا کرتا تھا ۔۔۔۔۔۔''

پھر وُہ جھکی اور کشتی چلا دی کشتی نے مین گرو کے درختوں کو پیچھے چھوڑا اور تیزی سے تیرنے لگی ۔ ہوا میں ایک خوشگوار خنکی تھی ۔ اُس کی ہدایات کے مطابق مسافروں نے اپنا سامان درست کرنا شروع کر دیا ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے لیے تو اپنے کاغذات اور سفری اخراجات سے زیادہ اہم اور کوئی شے نہ تھی اور اِنھیں میں ہمیشہ اپنی جیب میں محفوظ رکھتا تھا ۔۔۔۔۔ یکدم مجھے چھوٹی سی ہاتھی دانت کی کنگھی کا خیال آیا ۔ میں نے اپنا بیگ کھولا اور اُسے

تلاش کرنے لگا اور پھر اُسے اپنے کاغذات کے ساتھ رکھ کر اپنے سینے کی جیب میں ڈال لیا اور اُسے ایک سیفٹی پن لگا دی۔

وہ چھوٹی کنگھی میرے ایک نہایت قریبی دوست کی اکلوتی یادگار تھی۔ جب بھی میں اُس کی طرف دیکھتا سکون کے ساتھ پچھتاوا بھی محسوس کرتا۔

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب1954ء کا امن دوبارہ قائم ہوا تھا۔ میں اور میرا دوست اپنے آبائی گاؤں گئے۔ ہم دریا میکانگ کی ایک شاخ کے قریب رہتے تھے اور ہمسائے تھے۔ ہم دونوں1946ء کے آغاز میں مزاحمتی جنگ میں شامل ہوئے تھے اور یہ وہ دن تھے جب فرانسیسی ہمارے صوبے پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اُسے ''ساؤ'' کہا جاتا تھا کیونکہ بہن بھائیوں میں وُہ چھٹے نمبر پر تھا۔ اُس کی اکلوتی بیٹی صرف بارہ ماہ کی تھی۔ ہر مرتبہ جب اُس کی بیوی آزاد کردہ علاقے میں اُس سے ملاقات کو آتی تو وُہ اُسے اگلی بار بیٹی کو بھی ساتھ لانے کی تاکید کرتا۔ بیوی ایسا کرنے سے کتراتی رہی کیوں کہ راستے میں جنگل تھا۔ اُس کے لیے ایسا خطرناک سفر آسان نہ تھا چنانچہ ساؤ اُسے کیا کہہ سکتا تھا۔ پُورے آٹھ برس تک وہ اپنی بیٹی کو ایک چھوٹی سی پُرانی تصویر میں دیکھتا رہا۔ اور اب گھر واپسی پر اُس کے پدری جذبات بیان نہیں کیے جا سکتے تھے۔ کشتی ساحل کے قریب ہوئی۔ اُس نے ایک آٹھ سالہ بچی کو دیکھا جو سُرخ پھولوں والی بنیان اور کالی پتلون پہنے آرم کے درخت کے سایے میں ایک گھر کے صحن کے سامنے کھیل رہی تھی۔ اُس کے بالوں میں جُوڑا بنا ہوا تھا۔ اُس نے کشتی کے کنارے لگنے کا انتظار کیے بغیر چھلانگ لگا دی۔ کشتی پیچھے ہٹ گئی اور میں تقریباً لنک گیا۔ وُہ آگے بڑھا اور پھر چیخ کر کہنے لگا: ''تھو، میری بچی!''

اُس لمحے میں اُس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُچھلتی ہوئی اُس کے پاس آئے گی اور اُس کی گردن میں باہیں ڈال دے گی۔ وہ چند قدم اور آگے گیا اور جُھک کر بازو پھیلا دیے تاکہ اُسے آغوش میں لے سکے۔ اُس کی چیخ سے خوفزدہ ہو کر بچی اُسے اپنی گول گول آنکھوں سے تکے جا رہی تھی اور بہت کھوئی کھوئی سی اور کشش و پیچ میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ وُہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور جب بھی وُہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا اُس کے دائیں رخسار پر زخم کا نشان سُرخ ہو جاتا اور وہ دیکھنے میں بہت خوفناک لگتا۔ ایسے ہی چہرے اور کُھلے ہوئے بازوؤں کے ساتھ وُہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور کانپتی ہوئی آواز میں بڑبڑانے لگا: ''آؤ

میری بیٹی، آ جاؤ۔''		بچی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور وُہ آنکھیں جھپکاتی ہوئی
مجھے دیکھے جا رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو یہ کون ہے؟ اُس کا چہرہ یکلخت زرد پڑ گیا۔ وہ ایک دم
وہاں سے بھاگ نکلی اور ''ماں، ماں'' چلانے لگی۔ ساؤ بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔ اُس کی
آنکھیں اپنی بیٹی پر مرکوز تھیں۔ اُس کا چہرہ اذیت سے مسخ ہو رہا تھا اور ہاتھ یوں نیچے آ رہے تھے
جیسے مردہ ہوں۔

چونکہ یہ سفر خاصا طویل تھا ہمارے پاس گھر میں گزارنے کیلیے صرف تین دن تھے اور
ان دنوں میں تھوا پنے باپ کو پہچان نہیں سکتی تھی۔ اُس نے اُس رات اُسے اپنی ماں کے پاس
پھٹکنے تک نہ دیا۔ بڑی شدت سے احتجاج کرتے ہوئے وہ اپنے بستر سے نکل کر زمین پر کھڑی ہوگئی
اور اسے بھی کھینچ کر بستر سے باہر نکال دیا۔ دن کا بیشتر وقت وہ اُسے بہلانے کی کوشش کرتا رہا
لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ تھو نے اُسے ''ابا'' نہ کہا۔ جب اس کی ماں نے اُسے کہا کہ وہ
رات کے کھانے کے لیے باپ کو بلا لائے تو اُس نے جواب دیا: ''تم خود ہی جا کر بلا لاؤ۔''
ماں غصے سے پھٹ پڑی۔ اس نے چھڑی پکڑ کر پیٹنے کی دھمکی دی اور اصرار کیا کہ وہ
اس کی بات مان لے۔

''رات کے کھانے کے لیے آ جاؤ۔'' تھو نے بالآخر صرف اتنا کہا۔ ساؤ جیسے بہرا ہو
کر بیٹھا تھا اور لفظ ''ابا'' سننے کے انتظار میں تھا۔ وُہ باورچی خانے ہی سے اونچی آواز میں کہنے
لگی: ''رات کا کھانا تیار ہے۔'' ساؤ وہیں بیٹھا رہا۔ لڑکی اپنی ماں کی جانب غصے سے دیکھنے لگی۔
''میں نے وہی کچھ کیا ہے جو تم نے کہا تھا لیکن اُسے میرے بُلانے کی پرواہی نہیں ہے۔''
ساؤ نے سر جھٹکتے ہوئے بیٹی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ اس قدر دل گرفتہ تھا کہ
اس کے آنسو اُبل پڑنے والے تھے۔ چاولوں کی پتیلی چولہے پر چڑھا کر، اگلے کھانے کی تیاری
کرنے کے لیے، اس کی بیوی خورد و نوش کا سامان خریدنے کے لیے بازار جانے کے لیے تیار ہو
گئی۔ اس نے تھو سے کہا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ باپ سے مدد لے لے۔ پتیلی اُبل رہی تھی۔
لڑکی نے ڈھکنا اُتارا اور چاولوں میں چمچہ چلانے لگی۔ پتیلی بھاری ہونے کی وجہ سے وہ چاولوں
کی پیچ نہیں اُتار سکتی تھی۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ میں نے سوچا اب اس کی ہچکچاہٹ ختم
ہونے والی ہے کیوں کہ اب اس کے پاس مجھے مدد کے لیے بلائے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لمحے بھر کے
لیے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

''پتیلی اُبل رہی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے پیچ اتار دو۔'' اس نے اونچی آواز میں کہا۔ میں نے اسے باپ کو بلانے کا طریقہ سکھانے کے لیے کہا: ''تمھیں کہنا چاہیے تھا: ''ابا جی میری مدد کریں۔'' اس نے میرے الفاظ سنے ان سنے کر دیے اور اپنے ہی طریقے سے آواز بلند کہتی رہی: ''پتیلی اُبل رہی ہے، چاول جل جائیں گے۔''

ساؤ بے حس وحرکت کھڑا رہا۔

''اگر تم نے چاول خراب کر دیے۔۔۔۔۔۔۔'' میں نے اسے ڈرایا، ''تو تمھیں ماں سے مار پڑے گی۔ صرف اتنا کہہ دو: ابا جی میری مدد کریں۔''

اب پانی ابل ابل کر پتیلی سے باہر آ رہا تھا اس لیے وہ خوف زدہ سی ہو کر کچھ سوچتے ہوئے نیچے دیکھنے لگی۔ تاہم وہ اب بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ طیش میں آ کر اس نے پتیلی چولہے سے اتارنے کی کوشش کی لیکن نہ اتار سکی۔ اس نے دوبارہ اوپر دیکھا۔ اب پانی پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے جوش کھا رہا تھا۔ اس کی ہمت جواب دینے ہی والی تھی اور ممکن تھا کہ وہ چلانے لگے۔ اس نے پہلے پتیلی کو دیکھا، پھر ہم دونوں کو۔ وہ بیک وقت قابلِ رحم اور مضحکہ خیز لگ رہی تھی آخر کار اُس نے ایک بڑا چمچہ لیا اور اِسے پانی نکالنے کے لیے استعمال کرنے لگی اور جو کچھ وہ بڑبڑا رہی تھی وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ واقعی عجیب وغریب مخلوق تھی۔

کھانے کے دوران ساؤ نے مچھلی کے زرد انڈوں کو اُس کے سامنے رکھا لیکن ٹھو نے اُنھیں کھانے کی تیلیوں کے ساتھ پیالے میں ایک طرف رکھ دیا اور پھر یک دم اُنھیں پھینک دیا۔ چاول ہر طرف بکھر گئے۔ لڑکی کی اس حرکت پر ساؤ کو غصہ آ گیا اور اُس نے اُسے چوتڑوں پر پیٹا۔ ''تم اتنی خرد ماغ کیوں ہو؟'' اُس نے چیخ کر کہا۔

میرا خیال تھا کہ بچی خوب روئے گی یا بھاگ جائے گی لیکن وہ چپ بیٹھی رہی اور نیچے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے انڈوں کو اُٹھا کر واپس پیالے میں رکھ لیا۔ پھر وہ اٹھی اور خاموشی سے دریا کی جانب چلنے لگی۔ اُس نے کشتی میں بیٹھ کر اُس کی زنجیر کھولی اور جان بوجھ کر اسے کھڑکھڑا کر شور پیدا کیا اور پھر کشتی کھیتی ہوئی دریا کے پار چلی گئی۔ وہ اپنی دادی کے پاس پہنچی اور اُسے سب ماجرا کہہ سنایا اور پھر رونے لگی۔ اسے واپس لانے کے لیے ماں شام کو اس کے پاس گئی اور اسے سمجھایا کہ وہ گھر واپس آ جائے لیکن وہ نہ مانی۔ ساؤ کو اگلے روز چلے جانا تھا۔ اُس کی بیوی آخری رات اُس کے ہمراہ گزارنا چاہتی تھی اس لیے اُس نے بھی بیٹی کی واپسی کے

لیے زیادہ زور نہیں دیا۔

اگلی صبح ساؤ کو خدا حافظ کہنے کے لیے بے شمار رشتے دار آئے۔ تُھو بھی اپنی دادی کے ساتھ موجود تھی۔ وُہ لوگوں کے ساتھ اتنا مصروف تھا کہ لگتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی طرف بالکل متوجہ نہیں۔ اُس کی بیوی اُس کا سامان باندھ چکی تھی۔ تُھو کبھی تو چوکھٹ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور کبھی کسی کونے میں جا کر اپنے باپ کے گرد جمع لوگوں کو دیکھنے لگتی۔ وُہ کچھ بدلی دکھائی دے رہی تھی اور اُس کی ڈھٹائی کم ہو چکی تھی۔ اُس کے ماتھے پر کوئی شکن بھی نہیں تھی۔ اُس کی لمبی اور اُوپر کو اُٹھی ہوئی پلکیں، جو لگتا تھا کبھی نہیں جھپکیں، اس کی آنکھوں کو بڑا کر رہی تھیں۔ صاف ظاہر ہے وُہ کچھ سوچ رہی تھی۔

جب رخصتی کا لمحہ آن پہنچا تو سب کو خدا حافظ کہنے کے بعد ساؤ کی آنکھوں نے اُسے تلاش کیا۔ چاہتا تو وہ اسے گلے لگا نا تھا لیکن وُہ صرف اسے دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ پھر بھاگ نہ جائے۔ اس کی نظروں میں شفقت کے ساتھ ساتھ اداسی کی ایک جھلک بھی تھی۔ میں نے لڑکی کی آنکھوں میں ایک چمک دیکھی۔ ''خدا حافظ'' ساؤ نے نرمی سے کہا۔

''میرا خیال تھا وہ کونے میں کھڑی رہے گی لیکن غیر متوقع طور پر اُس نے چیخ کر کہا ''اب۔۔۔۔۔۔۔ با۔۔۔ ابا۔''

اس چیخ نے خاموشی کو پاش پاش کر دیا اور ہر ایک کے دل پر اثر کیا۔ یہ ''ابا'' جو کئی برسوں سے قید میں تھا اب آزاد ہوا تھا۔ تھو ہاتھ پھیلاتے ہوئے اپنے باپ کی طرف ایک گلہری کی سی تیزی کے ساتھ دوڑی۔۔۔۔ وہ اُس کی گردن کے ساتھ چمٹ گئی۔ لگتا تھا اُس کے بال اُس کے سر پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ باپ کے سینے کے ساتھ لگتے ہوئے اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا: ''ابا میں تمھیں نہیں جانے دوں گی، میرے پاس رہو۔'' باپ نے اُسے گلے لگایا، بھینچا اور وُہ اُس کے گال چومتی رہی، بالوں، گردن اور اُس کے چہرے کے نشان کو چومتی رہی۔ ''دادی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلی رات کو کیا ہوا تھا'' دراصل دادی یہ جاننا چاہتی تھی کہ تُھو نے اپنے باپ کو پہچاننے سے انکار کیوں کیا ہے اور اُسے ''ابا'' کیوں نہیں کہتی۔

''نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ میرا باپ نہیں ہے۔'' اُس نے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''جانتی ہو تمھارا باپ اتنا عرصہ گھر سے دور رہا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ تم اُسے پہچان نہیں

سکیں۔''

''یہ شخص اُس تصویر کی طرح بالکل نہیں ہے جو میرے باپ کی ہے۔''

''پھر بھی وُہ تمھارا باپ ہے۔شاید وُہ کچھ بڑی عمر کا لگتا ہے۔''

''نہیں اس لیے نہیں کہ وُہ بڑی عمر کا لگتا ہے، میرے باپ کے گال پر کوئی نشان نہیں۔''

چنانچہ دادی پُوری بات سمجھ گئی اور اُسے سمجھایا کہ اس کا باپ فرانسیسیوں سے جنگ کرنے گیا تھا اور وہاں زخمی ہو گیا تھا۔ اُس نے اُن جرائم کا قصہ بیان کیا جو نہر کے دوسرے کنارے پر واقع چوکی میں فرانسیسیوں نے کیے تھے۔لڑکی خاموشی سے سنتی رہی لیکن کبھی کبھار کسی بالغ انسان کی طرح اپنے سر کو جھٹکتی اور آہ بھرتی۔

اگلی صبح اُس نے دادی سے کہا کہ وُہ اُسے اس کے گھر چھوڑ آئے۔

اب وہ اپنے باپ کی چھاتی کے ساتھ چمٹتی جا رہی تھی۔ساؤ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا لیکن وُہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے سامنے رونے لگ جائے۔وُہ اُسے ایک ہاتھ سے اُٹھائے ہوئے چلنے لگا اور دوسرے سے اُس نے اپنے آنسو پونچھے۔اُس نے اُس کے بالوں کو چوما اور سرگوشی کی: ''اب بابا کو جانے دو۔ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔''

''نہیں'' لڑکی چیخی۔اُس نے اُس کے کندھوں کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کی مدد سے وُہ اُس کے ساتھ چمٹی رہی۔وہاں موجود لوگ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔ میں بھی آرام سے سانس نہیں لے رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں ساؤ سے کہوں کہ وہ چند روز اور ٹھہرا رہے لیکن اس میں کچھ مشکلات درپیش تھیں۔ہمیں ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ ہم نے جنوب میں رہنا ہے یا اکٹھے ہو کر شمال کو جانا ہے۔ اِس صورت میں کہ شاید ہمیں شمال کو جانا ہو ہمیں معینہ وقت پر واپس آنا تھا اور ضروری انتظامات کرنے تھے۔ہمیں اب چلے جانا تھا۔لوگوں نے لڑکی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

ساؤ کی بیوی نے پچکارا: ''بہت ہی پیاری تھو، اپنے بابا کو جانے دو۔ جب ہمارا ملک دوبارہ متحد ہو جائے گا تو واپس آ جائے گا اور پھر کبھی نہیں جائے گا۔''

دادی نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''میری اچھی بچی، اپنے باپ کو جانے دو۔ اِس سے ایک کنگھی لانے کی فرمائش کرو۔''

''میرے لیے ایک کنگھی خریدنا بابا اور اُسے گھر لانا۔'' تھو نے سسکی بھر کر کہا۔ تب اُس نے اپنی گرفت ڈھلی کی اور اپنے پاؤں پر گر گئی۔

''کچھ عرصے بعد میں اور ساؤ مشرقی نام بو گئے اور وہاں ایک بڑی تنظیم میں کام کرتے رہے۔ 1954ء سے لے کر 1959ء کا زمانہ بے حد تاریک تھا۔ امریکی ڈائم حکومت ایسے لوگوں کو گرفتار کر رہی تھی جن کا تعلق کسی زمانے میں تحریک مزاحمت سے رہا تھا۔ ہمیں جنگل میں رہنا پڑا تھا۔ وہاں ہماری زندگی میں بہت کچھ ہوا جسے بیان کرنے کے لیے ایک پوری رات درکار ہے۔ یہ بھی ہوا کہ صرف ایک رات میں تین مرتبہ کمانڈو سپاہیوں نے ہمیں گھیرا اور کبھی ہمیں درختوں کے پتے کھا کر پیٹ بھرنا پڑا لیکن یہ ایک اور کہانی ہے۔

''ہم اپنے جُھولوں میں رات بسر کرتے تھے اور اُن پر پلاسٹ شیٹ کی چھت ہوتی تھی۔ ساؤ اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا کہ اُس نے اپنی بیٹی کو پیٹا تھا۔ ایک مرتبہ وہ یک دم اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا: ''یہاں کے لوگ اکثر ہاتھیوں کے شکار کو جاتے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ شاید مجھے کسی سے ہاتھی دانت کا کوئی ٹکڑا مل جائے اور میں اُس سے اپنی بیٹی کے لیے ایک کنگھی بنالوں۔''

''اس کے بعد وہ اِسی اُمید کے خواب میں مُبتلا رہا۔ کُچھ عرصے کے بعد جب ہمارے پاس خوراک کم ہونے لگی تو ہم نے تیر کمانوں کے ساتھ شکار کرنے کے بارے میں غور کیا۔ ہم بندوق استعمال نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ ہم جنگل کی خاموشی کو توڑ کر اپنے ہونے کا پتہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ ہمیں ہاتھیوں کے شکار کے بارے میں کُچھ پتا نہ تھا اور یہ ایک اتفاق تھا کہ ایک ہاتھی ہمارے سامنے آ گیا۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس کھیل میں دلچسپی نہ تھی لیکن ساؤ نے اُس کا پیچھا کیا۔ وہ ایک دوست کے ہمراہ جھاڑیوں میں چھپ کر اُس قریب آنے کا انتظار کرنے لگا اور اُنھوں نے اُس کی آنکھوں کے عین درمیان میں نشانہ لگا لیا۔

مجھے اب بھی وہ دوپہر یاد ہے۔ جنگل میں برستی بارش تھم چکی تھی اور درختوں کے پتوں پر پانی کے قطرے چمکتے تھے۔ میں اپنی پلاسٹک کی چھت کے نیچے کام کر رہا تھا کہ میں نے شور وغل کی آواز سُنی۔ میں نے اوپر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ساؤ اُس راستے پر بھاگ رہا ہے جو ہماری طرف آتا ہے۔ اُس نے ہاتھی دانت کا ایک ٹکڑا فضا میں بلند کر کے مجھے دکھایا۔ اُس کا چہرہ کسی بچے کے چہرے کی طرح دمک رہا تھا۔ بعد میں اُنے بیس ملی میٹر کا کارتوس توڑ کر ایک چھوٹی سی

آ ری تیار کی ہم اُسے اکثر اُس ہاتھی دانت کے ٹکڑے پر مشقت کرتے دیکھتے تاکہ وُہ اُس میں سے ایک کنگھی بنا سکے اور وُہ ایک ماہر کاریگر کی طرح بڑی سنجیدگی اور ہنرمندی سے ایسا کرتا رہتا۔ میں اُسے یہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور بے حد دلچسپی لیتا وہ عام طور پر روزانہ کنگھی کے دو دندانے بنا لیتا اور جلد ہی اُس نے پُوری کنگھی بنا لی جو کہ دس سنٹی میٹر لمبی اور ڈیڑھ سنٹی میٹر چوڑی تھی۔ اور کنگھی کے دستے پر اُس نے بڑی مُشکل سے مندرجہ ذیل الفاظ کھودے: ''اپنی بیٹی تُھو کے لیے۔۔۔۔ پیار اور نیک خواہشات کے ساتھ۔''

اُس کی بیٹی کو یہ کنگھی استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن ساؤ کی ذہنی پریشانیاں کم ہوگئیں۔ رات کو وہ اسے پہروں دیکھتا رہتا۔ کبھی وہ اِسے اپنے بالوں پر رگڑ رگڑ کر چمکاتا رہتا۔ ساؤ اپنی بیٹی کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک افسوسناک واقعہ پیش آ گیا۔ یہ1958ء کے آخر کی بات ہے جب ابھی ہمارے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ امریکیوں اور کٹھ پُتلی حکومت کے کارندوں کے ایک حملے میں ساؤ مارا گیا۔ ایک امریکی جہاز سے چلائی گئی گولی اُس کے سینے میں لگی۔ مرنے سے پیشتر اُس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وُہ کوئی وصیت کرسکتا۔ اُس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور کنگھی نکال لی۔ مجھے کنگھی تھما کر وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ اس لمحے اس کی نگاہوں کی جو کیفیت تھی میرے پاس اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ بس یہ بتا سکتا ہوں کہ اُس دن کے بعد اکثر میں اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا ہوں اور اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوتی ہیں۔

''میں ہرصورت یہ کنگھی تمھاری بیٹی تک پہنچاؤں گا۔۔۔۔۔'' میں نے اُس کے کان کے قریب مُنہ لیجا کر ہولے سے کہا۔ یہ سُن کر ساؤ نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کرلیں۔

مجھے یہ بتانا ہوگا کہ اُن منحوس ایام میں رُوپوشی نہ صرف زندوں کے لیے ضروری تھی بلکہ آپ یقین کیجئے گا مردوں کے لیے بھی چُھپنا ضروری تھا۔ ساؤ کی قبر بھی زمین کی سطح سے اونچی نہیں بنائی جا سکتی تھی کہ کہیں اُس کا نشان پا کر دشمن اُس کی لاش کی بے حرمتی کرے۔ ہاں میں نے ایک نزدیکی درخت پر ایک نشان کھود دیا تاکہ نشانی رہے۔

ہمارے کامریڈ ان ایام میں یوں زندگی بسر کرتے تھے اور ایسے ہی مرتے تھے۔ یہ ناقابلِ برداشت تھا اور تبھی ہمیں ہتھیار اُٹھانا پڑے۔

کچھ عرصے بعد میں ایک نسبتاً محفوظ مزاحمتی چوکی پر تعینات تھا۔ میرا ایک رشتے دار مجھے ملنے آیا۔ میں وہ کنگھی تُھو کو بھیجنا چاہتا تھا لیکن اُس نے مجھے بتایا کہ تھو اور اُس کی والدہ گاؤں چھوڑ

کر سائیگان یا سرکنڈوں کے میدان جا چکے ہیں۔ ان کے گاؤں میں امریکیوں اور کٹھ پتلی فوجیوں نے ''ٹوکانگ'' کورس کیے تھے۔ اُنھوں نے لوگوں کے گھر جلا کر اُنھیں کیمپوں میں نظر بند کر دیا تھا۔ کچھ برسوں بعد وہ جگہ بالکل ویران ہوگئی۔

میں نے وہ کنگھی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے میں بہت اذیت محسوس کر رہا تھا۔

کشتی کی موٹر پھٹپھٹاتی جا رہی تھی۔ میں بڑی شدت سے خواہشمند تھا کہ اُس لڑکی کا چہرہ دیکھ لوں جس پر میری سلامتی کا انحصار ہے۔ رات بہت تاریک نہ تھی اور تاروں بھرے آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ مدھم روشنی میں لڑکی کا چہرہ ٹھیک نظر نہیں آ رہا تھا سوائے اُس کی گول شکل اور دونوں آنکھوں کے جن کی نظروں کو بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اُسے کہیں مل چکا ہوں۔

یک دم کسی نے ''ہوائی جہاز، ہوائی جہاز'' کا شور مچا دیا۔

کشتی مسافروں کی بے چینی کی وجہ سے ہچکولے کھانے لگی۔ کئی لوگ چیخنے لگے:

کنارے کی طرف چلو، کنارے کی طرف چلو''

''ہوائی جہاز کہاں ہے؟''

''اس کی روشنیاں ہمارے عقب میں دکھائی دے رہی ہیں۔''

''کنارے کی طرف چلو۔کنارے کی طرف۔۔۔۔۔ایک جیٹ ہماری طرف آ رہا ہے۔''

رابطہ لڑکی نے کشتی کی رفتار آہستہ کی اور کچھ دیر کے لیے آسمان کی طرف دیکھا۔''یہ ہوائی جہاز نہیں کسی ستارے کی روشنی ہے۔''

اُس کی پُرسکون آواز نے کشتی میں پھر سے سکون بحال کر دیا۔اس کی آواز ایسی ہی لوچدار میٹھی آواز تھی۔اُس نے کشتی کی رفتار پھر تیز کر دی۔

کئی دنوں کے پیدل مارچ کے بعد موٹر بوٹ پر سفر بہت خوشگوار لگ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں دشمن کے ہوائی جہازوں سے خوفزدہ تھا۔کشتی ایک نہر میں چلی جا رہی تھی جو ایک کھلے کھیت میں سے گزرتی تھی۔ یہاں پر کوئی مکان نہ تھی سوائے بانس کے جھنڈوں کے جو خاصے فاصلے پر تھے۔شاید رابطہ لڑکی کو میرے خیالات کا علم ہوگیا اور اُس نے کشتی تیز کر دی۔ پانی تیزی

سے اچھل رہا تھا اور اس سے اُٹھنے والی لہریں کناروں تک پہنچ کر گھاس اور جنگلی پودوں کی جڑوں کو کپکپا رہی تھیں۔

تمام مسافر پرسکون تھے اور سفر کا لطف اٹھا رہے تھے کہ افسر رابطہ نے کشتی کا انجن بند کر دیا اور چیخ کر کہا: ''ہوائی جہاز۔''

وُہ کشتی کو ایک بانس کے جھنڈ کی جانب لے گئی۔ ہمارے عقب میں آنے والی ایک اور کشتی نے بھی وہیں پناہ لی۔ اب ہم نے امریکی ہیلی کاپٹروں کی گھوں گھوں کی آواز سُننی شروع کر دی۔ مجھے یہ معلوم تو نہ تھا کہ کہانی کے مطابق اُس کی سونگھنے کی حس کتنی تیز ہے لیکن یہ بات حیران کُن تھی کہ اُس نے موٹر بوٹ کے انجن کے شور میں بھی ہیلی کاپٹروں کی آواز سن لی تھی۔

کشتی ہچکولے کھانے لگی اور کچھ مسافروں کا توازن بگڑ گیا۔ وُہ انھیں تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی: ''چچا جان، خاموش رہیے۔ ہیلی کاپٹر ابھی دُور ہیں۔ کنارے پر کُود کر ادھر ادھر پھیل جائیں اور خود کو چُھپا لیں اور اگر وُہ آپ پر چمکتی روشنیاں پھینکیں تو بالکل بے حس و حرکت بیٹھے رہیے۔''

وہ ہدایات دے رہی تھی اور اس دوران میں میرے علاوہ سب لوگ کنارے پر جا چکے تھے۔ میں کُودنے کو تھا کہ لڑکی کہنے لگی: ''چچا تم یہیں رہ جاؤ۔ کشتی میں چند لوگ ہی تو ہیں۔ فکر نہ کرو۔''

اگر یہ مشورہ کوئی اور دیتا تو میں ہرگز اس پر عمل نہ کرتا لیکن اُس کے طرزِ عمل نے مُجھے اتنا متاثر کیا تھا کہ میں کشتی میں ہی بیٹھا رہا۔ ہیلی کاپٹر آنے لگے اور نہر کے دوسرے سرے سے اُن کی چمکتی روشنیاں ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ اس قسم کے حملے کے لیے امریکی تین ہیلی کاپٹر استعمال کرتے تھے۔ ایک روشنی پھینکتا جاتا تھا اور باقی دو گولیاں برساتے جاتے تھے۔

لڑکی نے پھر اپنا مشورہ دہرایا: ''درختوں کے پتوں سے اپنے آپ کو چھپا لو اور بالکل دم سادھے بیٹھے رہو۔''

ہیلی کاپٹروں کی روشنی میں آنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ جب روشنیاں مجھ پر پڑ رہی تھیں تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں اپنے اوپر اُن کے پَروں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کشتی انھیں نظر آ جائے گی کیوں کہ رُوپوشی کے لیے استعمال کرنے والی چیزیں اُڑ گئی تھیں اور ہمارے سامان کے تھیلے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میں نے سوچا کہ بس اب میرا

انجام قریب ہے اور میں نے اپنے گھٹنوں میں سر دبا کر اپنے آپ کو چھوٹا کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی نے مجھے خاموش کرانے کے لیے کہا: ''جس طرح ہم اُنھیں دیکھ رہے ہیں وہ ہمیں نہیں دیکھ رہے۔'' اُس کے لفظوں کا وہ اثر تو نہ ہوا جو پہلے ہوا تھا لیکن مجھے یہ ترکیب سوجھی کہ پانی میں چھلانگ لگا دوں لیکن عین وقت پر میں نے اپنے آپ کو روک لیا۔

وہ خوفناک روشنی کم ہوتی گئی اور انجنوں کا شور گھٹتا گیا اور پھر ہیلی کاپٹر بتدریج دُور ہوتے گئے۔ سب کُچھ پھر تاریک ہوگیا لیکن میں پھر بھی حرکت نہیں کر رہا تھا کہ کہیں دشمن دوبارہ نہ آ جائے۔

''وہ اپنی طاقت کا مظاہر کرتے ہیں لیکن اُنہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ ہمیں صرف پُرسکون رہنا چاہیے اور حرکت نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ پھر اُس نے کھیت کی جانب دیکھا اور مسافروں کو واپس آنے کے لیے کہا۔ کئی تو نچڑ رہے تھے۔ وہ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔ کشتی پھر چل پڑی۔

نصف شب کے قریب ہمارا گروہ کنارے پر اُتر گیا اور پھر پیدل سفر شروع کر دیا۔ ہم دھان کے ایک کھیت میں قطار بنا کر چل رہے تھے جہاں دلدلی، ناہموار اور پھسلواں گڑھے تھے۔ ہم اپنی چپلیں ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے تھے اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے تھے۔ پھر بھی اکثر ہم ایک دوسرے کے اُوپر جا گرتے۔ دریا کے کنارے کے قریب ایک جگہ رابطہ لڑکی نے ہمارے گروہ کو رُکنے کا حکم دیا اور پھر دو لڑکوں کو اس علاقے میں روانہ کیا تاکہ پتہ چلے کہ وہاں صورت حال کیسی ہے۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اُن کی دشمن کے کمانڈو سپاہیوں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو حسبِ سابق دریا کے کنارے باغوں میں نہیں چھپایا ہوا تھا بلکہ وہ براہ راست حملہ آور ہو گئے۔ ہر سمت سے گولیاں چلنے لگیں اور کارتوس ہوا میں اُڑنے لگے۔

''بھائی تُو، تم اس گروہ کو لے کر آگے جاؤ۔ میں یہیں ٹھہروں گی۔'' رابطہ لڑکی نے حکم دیا۔ اُس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہماری لیڈر بھی وہی ہے۔ مجھ میں ایک عجیب سی خواہش نے جنم لیا: یہ کہ میں اُسے کہوں کہ وہ یہاں ٹھہرنے کی بجائے ہمارے ساتھ چلے لیکن وہ ابھی سے بہت دور ہو چکی تھی۔ گولے سیٹیاں بجاتے ہوئے آ رہے تھے اور کچھ فاصلے پر گر رہے تھے۔ ہم گڑھوں کے بالکل ساتھ دبکے ہوئے تھے اور اپنے سروں کو نیچے رکھنے کی احتیاط کر رہے تھے۔

میں نے اپنے بائیں طرف کاربین کے فائر کی آواز سُنی اور اس کے ساتھ ہی تمام تر گولیوں کا رُخ ادھر ہو گیا۔ تب میں جان گیا کہ رابطہ لڑکی نے جان بوجھ کر دشمن کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی ہے۔

''تو، بھاگ جاؤ'' حکم آیا۔ ہمارا گروہ آگے بھاگنے لگا۔ مجھے دراصل فائرنگ کی عادت نہ تھی لیکن میں خوفزدہ نہیں تھا۔ میرے سارے خدشے رابطہ لڑکی کے مقدر کے لیے تھے۔ ہم کھیت میں ادھر ادھر بھاگتے چلے جا رہے تھے اور ہمارا رُخ گھنی جھاڑیوں کی طرف تھا اور وہاں سے دریا تک جسے ہم نے بحفاظت عبور کر لیا۔

گولیوں کی بوچھاڑ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ میں نے لڑکی کی کاربین کا فائر سننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور یوں میری فکرمندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہم جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا کمانڈوز کی زد سے نکلے اور متعینہ جگہ پر وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ یہ ایک گاؤں میں درخت کی ٹہنی تھی۔ لیکن ہمیں ڈی اے چوکی سے بھیجے جانے والے نئے راہنماؤں کے لیے زیادہ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ہم اناس کے ایک کھیت میں جمع تھے جس پر دشمن نے زہریلی گیس چھڑک دی تھی اور یوں پودے پھل نہیں دیتے تھے۔ ہم سب موجود تھے۔ کچھ کی ربڑ کی چپلیں اور چند ایک سامان کے تھیلے دریا عبور کرتے ہوئے ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ اگرچہ میں عمر میں ان سب سے بڑا تھا لیکن میری کوئی شے گم نہیں ہوئی تھی۔

ہم سب بے حد تھکے ہوئے تھے۔ راہنماؤں نے ہمیں صرف ایک رات آرام کرنے دیا۔ کُچھ نے اپنے تھیلے درختوں پر لٹکائے اور اپنے بیگ سروں کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ جلد ہی وہ خراٹے لے رہے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کچھ پریشانی کے عالم میں اونگھنے لگا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے آبائی گاؤں کو جا رہا ہوں۔ کئی گاؤں کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے تھے۔ اِن کے باسیوں کو نظر بندی کیمپوں میں بند کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے گھروں کو گرا دینے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ بعد میں ان کو ملیامیٹ کر دیا گیا۔ باغات بھی بالکل بدل چکے تھے۔ مجھے وہ تمام مناظر پھر سے دکھائی دینے لگے جو میں نے ساؤ کے ہمراہ دیکھے تھے جب ہم اپنے گاؤں آئے تھے اور جب ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوئے اور مجھے وہ کنگھی دے رہا تھا جو اب بھی میرے پاس تھی۔ کبھی کبھار میری نیند کھل جاتی اور میں اُن ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگتا جو ہمارا پیچھا کرنے والوں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات تھے اور اُن میں وہ رابطہ

لڑکی بھی شامل تھی۔ پتہ نہیں ان سب کے ساتھ کیا بیتی ہو گی؟ میں نے اپنے آپ سے پُوچھا اور پھر تھکن سے نڈھال ہو کر سو گیا۔

میں نے قدموں، آوازوں اور قہقہوں کا ہلکا شور سُنا اور بالآخر جب میں بیدار ہوا تو صبح ہو رہی تھی۔ بادل پٹیوں کی طرح آسمان سے لٹک رہے تھے۔ لوگ خوشدلی سے گفتگو کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ رابطہ لڑکی پہنچ چکی تھی اور اُس کے کپڑے بالکل نچڑ رہے تھے اور اُن میں کیچڑ بھی تھا۔ یوں وُہ بالکل وقت پر ہمارے ساتھ آن ملی۔

جونہی میں گروہ کے قریب ہوا اُنھوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کیا۔ میں نے اس مرتبہ رابطہ لڑکی کو زیادہ قریب سے دیکھا۔ وہ کمانڈوز سے جنگ کر کے واپس آ رہی تھی اور ایک خطرناک صورت حال سے نکلی تھی لیکن اس کے باوجود وہ یوں لگ رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اُس کے چہرے پر سُورج اثر انداز ہو چکا تھا اور اُس کی آنکھیں چمکتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ وہ شاید بیس برس کی ہو گی اُس کے کانوں سے لٹکتے جھمکوں کی وجہ سے وہ ایک ننھی سی بچی لگ رہی تھی۔ وہ میری جانب آئی۔ میں اپنے جذبہ تشکر اور تحسین کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اُسے خوش آمدید کہا: ''بھتیجی میں تمھارے بارے میں فکر مند تھا۔ تم اپنے خاندان میں کون سے نمبر پر ہو!''

''میں سب سے پہلے پیدا ہوئی تھی، چچا''

''سب لوگ تمھیں بہت اُت کیوں کہتے ہیں؟ شاید اس لیے کہ تم۔۔۔۔۔۔''

''نہیں۔'' اُس نے مجھے فقرہ مکمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ ''میں اپنے خاندان میں سب سے پہلے پیدا ہوئی اور سب سے آخر میں بھی۔۔۔۔۔۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔''

''تمھارے گاؤں کا کیا نام ہے؟ میرا خیال ہے میں اس سے پیشتر تم سے مل چکا ہوں۔''

''میں گلاؤ گینگ کی رہنے والی ہوں۔''

اپنے آبائی گاؤں کا نام سُن کر مجھے جُھرجُھری سی آ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں نے کہا: ''چوموئی ضلع میں واقع گاؤں گلاؤ گینگ جو چاؤ ساصوبے میں ہے؟ کیا وہی؟''

''ہاں۔''

''تمھارا نام کیا ہے!''

''تھو'

''تھو، کیا واقعی؟'' میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔''تمھاری باپ کا نام ساؤ ہے اور تمھاری ماں کا نام ہنہ ہے۔کیا میں ٹھیک کہتا ہوں؟''

وہ اتنی متعجب ہوئی کہ اُس کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا اور وُہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتی رہی۔

اور اسی وقت ڈی۔اے۔چوکی کے راہنماؤں نے ہمیں چلنے کے لیے تیار ہونے کا کہا۔لیکن مجھے اُن کے کہنے کی کوئی پروانہ تھی اور نہ ہی میں اس وقت کچھ اور سُننا چاہتا تھا۔

ہم دونوں میں سے کوئی بھی حیرت سے باہر نہیں آیا تھا۔وُہ مجھے مسلسل گھورتی رہی۔

''بس یہ آنکھیں میری ہی بھتیجی کی ہیں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا اور دوبارہ پُوچھا،''بھتیجی تمھارے باپ کا نام ساؤ ہے نا،؟''

''ہاں لیکن تم کیسے جانتے ہو؟''

میں نے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا:''میں تمھارا چچا ہوں۔کیا تمھیں وہ دن یاد ہے جب تمھارے باپ نے گھر چھوڑا تھا اور تم سے ایک کنگھی لانے کا وعدہ کیا تھا؟''

اُس نے آہستہ سے سر ہلایا''ہاں مجھے یاد ہے۔''

اس طرح کی غیر متوقع ملاقاتیں مزاحمتی جنگ کے دوران اکثر ہو جاتی ہیں۔لڑکی پر ایک نگاہ ڈال کر میں نے ہاتھی دانت کی کنگھی اپنی جیب سے نکالی۔''یہ تمھارے باپ نے تمھارے لیے بھیجی ہے۔اُس نے اِسے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔''

اُس کے حیرت میں گم چہرے پر اس کی آنکھیں پہلے سے بڑی لگ رہی تھی۔اُس نے وہ کنگھی لے لی جو یوں لگتا تھا اُسے اُس دن کی یاد دلا رہی ہے جب وہ اپنے باپ سے جدا ہوئی تھی۔اِس منظر نے مجھے بہت دکھ دیا۔مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت خوش ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی خوشی کو رنج میں بدلوں۔''تمھارا باپ بالکل ٹھیک ہے۔وہ گھر واپس نہیں آ سکتا تھا اس لیے اُس نے مجھے یہ کنگھی تمھارے لیے دے دی۔''

اُس کی پلکیں کپکپائیں اور وہ سرگوشی میں بولی:''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔یہ کنگھی

میرے باپ کی جانب سے ہرگز نہیں ہے۔''

میں بے حد مایوس ہوا بلکہ کچھ فکر مند بھی اور اُس سے پُوچھا:''تمہارے باپ کا نام ساؤ ہے اور ماں کا ہنہ۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں'' وہ رونے والی تھی کیوں کہ آنسو اُس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے لیکن اُس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔''اگر تمھیں غلط فہمی نہیں ہوئی تو تم جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے ہو۔ کیوں کہ تم مجھے دُکھ نہیں دینا چاہتے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا باپ مر چکا ہے۔'' اُس کی آنکھوں میں پھر چمک آئی اور اُس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔''میں اپنے دکھوں پر قابو پا سکتی ہوں۔ تمھیں مجھ سے سچ کہہ دینا چاہیے۔ مجھے دو سال پہلے پتا چل گیا تھا کہ میرا باپ مارا گیا ہے اور تب میں نے اپنی ماں سے ایک رابطہ افسر بننے کی اجازت لی تھی۔''

وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اُس کے گلے میں ہی دم توڑتے جاتے تھے۔ اُس نے سر جھکا کر زمین کو دیکھا۔ اُس کے بال کپکپائے۔ میں خاموش رہا۔ گروہ میں شامل میرے ساتھی چیخ چیخ کر مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں زیادہ دیر تک نہیں رُک سکتا۔ میں نے اُس کا پتہ پوچھا اور اُس کی ماں اور رشتے داروں کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔

تُھو سے ملاقات کی خوشی صرف چند لمحوں کی تھی۔ میرے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے اُس پر ایک نگاہ ڈالی اور جبلی طور پر کہا:''خدا حافظ میری بیٹی!''

وُہ کچھ بڑبڑائی جو میں سُن نہ سکا۔ کچھ دور جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک گڑھے کے قریب رُکی۔ دھان کے چھوٹے چھوٹے پودے، جو ہوا سے جُھوم رہے تھے، ان لہروں سے مشابہت رکھتے تھے جو اُس کی جانب بہتی جا رہی تھیں۔ پس منظر میں زہریلی گیس سے تباہ شدہ اور پتوں سے عاری ناریل کے درخت مچھلی کے دیوزاد ڈھانچوں کی طرح ہوا میں لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے تازہ پتے نکل آئے تھے اور وہ دور سے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے تلواروں کا ایک جنگل ہے جس کا رخ آسمان کی جانب ہے۔

پریتم کمار
ملائشیا

دیوار کے اُدھر

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو ایسے گھر تھے جو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ دراصل گھر تو ایک ہی تھا اور اس کی چھت بھی ایک ہی تھی لیکن اس میں دو مختلف خاندان رہ رہے تھے اس لیے انھیں دو گھر ہی کہنا چاہیے۔ پہلے گھر میں ایک پنجابی شخص رہتا تھا اور دوسرے میں ایک چینی۔ پنجابی کا خاندان کا ایک بیوی، کئی بیٹوں اور ایک ننھی سی بچی پر مشتمل تھا۔ وہ گائیں پالتا تھا۔ ادھر چینی شخص کے بھی بیوی بچے تھے اور وہ رکشا چلاتا تھا۔ چینی اور پنجابی کے گھر کی ایک دیوار مشترکہ تھی اور اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ اور جھریاں تھیں۔ پنجابی خاندان بڑی آسانی سے دیوار میں سے جھانک کر دیکھ سکتا تھا کہ ادھر چینی گھر میں کیا ہو رہا ہے اور انھیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ادھر سے چینی خاندان بھی تانک جھانک کرتا رہتا ہے۔ یہ دیوار چھت تک نہیں پہنچتی تھی اور دونوں گھروں کا بالائی کھلا حصہ مشترکہ تھا۔ پنجابی بچے کبھی کبھار شہتیروں سے بنی ہوئی اس دیوار پر چڑھ کر چینی گھر میں جھانکنے لگتے۔

یہ دونوں گھر اور اس میں آباد خاندان ایک عرصے سے پہلو بہ پہلو رہتے آئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ چینی عورت روز بہ روز، جیسا کہ حاملہ عورتیں ہوتی ہیں موٹی ہونے لگی اور چھوٹی بچی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے چینی عورت کو گھورتی رہتی اور جب کبھی چینی عورت اس کی جانب دیکھتی تو وہ فوراً منہ بند کر

لیتی اور دوسری طرف دیکھنے لگتی اور جونہی چینی عورت کا دھیان کسی اور طرف ہوتا وہ دوبارہ اس پر نظریں جما دیتی۔ یہ آنکھ مچولی ایک مدت جاری رہی لیکن چھوٹی بچی یہ نہ جان سکی کہ آخر اس خاتون کو ہوا کیا ہے۔ انہی دنوں پنجابی کی ایک گائے بھی بچہ دینے والی ہوگئی۔ چھوٹی بچی کو اس گائے میں دوسری گائیوں کی نسبت کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ''صرف یہ ہے کہ موٹی ہوتی جا رہی ہے۔'' اس نے سوچا۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا اور چھوٹی بچی اس چینی عورت کو نہ بھول سکی کیونکہ وہ ہمیشہ سامنے ہی تو ہوتی تھی۔ ایک صبح چھوٹی بچی نے عجیب وغریب اور بہت ہی بلند چیخیں سنیں جو دیوار کی دوسری طرف سے آ رہی تھیں۔

ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بلی زور زور سے رو رہی ہے۔ بچی کی ماں اٹھی اور بھاگتی ہوئی چینی عورت کے گھر چلی گئی اور جب بچی نے بھی اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا تو اسے جھڑک دیا گیا کہ ''خبردار اگر میرے پیچھے آئیں تو تھپڑ ماروں گی۔'' بچی پچھواڑے میں واقع باورچی خانے کی طرف بھاگی کہ شاید یہ آواز وہاں سے آ رہی ہے لیکن نہیں، آواز دیوار کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ اس نے فوراً دیوار کے سوراخوں اور جھریوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے صرف چارپائی کے پائے اور اپنی ماں کے پاؤں نظر آئے۔

بچی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ وہ ہر صورت میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن دیکھ نہیں سکتی تھی۔ پھر اس نے اوپر دیکھا کہ اس کا بھائی دیوار کے ساتھ چمٹا ہوا ہے اور اوپر سے دوسری طرف جھانک رہا ہے۔ اس نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن اس کے بھائی نے ایسا نہ کرنے دیا اور اسے جھڑک کر ٹانگیں ماریں۔ اس دوران بلی ایسی چیخیں تو سنائی دیتی رہیں لیکن بچی کو کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کے بھائی نے بھی اُسے بالکل نہ بتایا کہ اس نے دیوار کے اوپر سے کیا دیکھا تھا اور جب وہ کافی دیر کے بعد نیچے آیا تو اس نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ اسی وقت اس کی ماں واپس آ گئی اور اس نے بتایا کہ چینی عورت کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی ہے۔

بچی کی ماں ابھی ہاتھ دھو رہی تھی کہ اس کے باپ کی گرجدار آواز سنائی دی کہ ان کی گائے کے بچہ جننے کا وقت بھی آ گیا ہے۔ بچی کو شکر کا ایک ٹین دیا گیا اور کہا گیا کہ اسے فوراً اپنے باپ کے پاس لے جائے۔ وہ بھاگتی ہوئی پہاڑی پر پہنچی جہاں گائیوں کا باڑہ تھا اور وہاں اس نے بچھیا کو دیکھا: چھوٹی سی سفید اور بھوری اور گیلی۔۔۔ اور گائے اسے چاٹ رہی تھی۔ باپ

نے بچی سے شکر لی اور بچھیا کا منہ میٹھا کیا اور اسے بتایا کہ وہ گائے سے پرے رہے ورنہ وہ اسے سینگ مارے گی ۔ بچھیا بالکل نئی نکور تھی اور وہ ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتی تھی اور اس کوشش میں گر جاتی تھی اور گائے اس کے گرد چکر لگا رہی تھی ۔ بچی نے اس سے پہلے بھی کئی نئے نکور بچھڑے دیکھے تھے لیکن اس بار وہ اس بات پر حد سے زیادہ حیران تھی کہ بچھیا اور چینی عورت کی بچی ایک ہی وقت میں کیسے نمودار ہوگئے ۔ اس نے اپنے باپ سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے ۔

بچھیا اور ننھی بچی ساتھ ساتھ بڑے ہونے لگے لیکن لڑکی کے خیال میں بچھیا زیادہ خوبصورت تھی ۔ چینی عورت اگرچہ بہت گوری تھی لیکن اس کی ناک بالکل چپٹی تھی اور آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں اور وہ پنجابن کے نزدیک بالکل خوبصورت نہ تھی ۔ چینی عورت نے چھت کے ایک شہتیر کے ساتھ لوہے کا ایک سپرنگ لٹکایا اور اس میں ایک سارونگ لگا دیا ۔ اس میں وہ اپنی بچی کو ڈال دیتی اور جھلاتی رہتی ۔ بچی بڑی ہوتی گئی اور جب وہ چند مہینوں کی ہوگئی تو وہ مسکرانے لگی اور پیاری لگنے لگی ۔ چینی خاندان میں ایک چینی دادا جان بھی تھے ۔ یہ دادا جان جب بھی گھر لوٹتے بڑبڑانا شروع کر دیتے ۔

چینی عورت تو خاموش رہتی صرف اس کا خاوند بڑے میاں کے ساتھ باتیں کرتا اور کبھی کبھار چلانے بھی لگتا ۔ دادا بچی کی پیدائش کے بعد کچھ زیادہ ہی شور مچانے لگا تھا اور وہ چینی زبان میں جھڑکیاں دیتا رہتا جو دیوار کی دوسری جانب صاف سنائی دیتی تھیں ۔ کبھی کبھار بلند چینی شور کے بعد چینی عورت بچی کو گود میں لے کر ہولے ہولے رونے لگتی اور جب کبھی ایسا ہوتا لڑکی دیوار کی جھریوں میں سے جھانکتی اور عورت کو روتے اور ناک دباتے ہوئے دیکھتی ۔

ایک روز دو ملائی عورتیں چینی عورت کے گھر میں آئیں ۔ انھوں نے بچی کو غور سے دیکھا ، اسے اٹھایا اور اس کے رخساروں کو پیار سے انگلیوں سے چھوا اور اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں اور لڑکی دیوار میں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی ۔ تھوڑی دیر بعد ملائی خواتین چلی گئیں ۔ وہ کچھ دنوں بعد دوبارہ آئیں ۔ ان کے پاس کپڑوں کی ایک ٹوکری تھی ۔ انھوں نے بچی کو نئے کپڑے پہنائے اور اسے ساتھ لے گئیں ۔ لڑکی اس وقت گھر سے باہر تھی اور اس نے چینی عورت کو اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑے ہوکر روتے دیکھا ۔ عورت کے ہاتھ خالی تھے ۔ دادا جان گھر کے اندر بے پناہ شور مچا رہے تھے ۔ ملائی خواتین نے بچی کو دیکھا اور پھر چینی عورت کی طرف مسکرا کر

دیکھا اور چلی گئیں۔ بچی کو وہ ساتھ لے گئیں۔ چینی عورت نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ لڑکی بھی بھاگتی ہوئی اپنے گھر میں چلی گئی اور وہاں دیوار کے ایک سوراخ میں سے اس نے دیکھا کہ ہمسائی بستر پر بیٹھی رو رہی ہے۔ پھر وہ اُٹھی اور لوہے کے سپرنگ اور سار ونگ کے خالی جھولے کو جھلانے لگی۔ خالی جھولا جھولتا رہا۔ وہ چلا رہی تھی اور کوئی گیت بھی گا رہی تھی۔ پنجابن نے کہا چینیوں نے اپنی چھوٹی بچی کو ملائی خواتین کے ہاتھ نوے ڈالر میں فروخت کر دیا ہے۔ پنجابی باپ نے کہا کہ اس کی بچھیا کے لیے کوئی بھی نوے ڈالر نہیں دے گا۔

چینی عورت اس روز اور اس سے اگلے روز بھی گھر سے باہر نہ نکلی۔ پنجابن نے بتایا کہ وہ بیمار ہے اور جب لڑکی نے دوبارہ دیوار کے ایک سوراخ میں جھانک کر دیکھا تو چینی عورت بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ اپنی چھاتی پر باندھ رکھے تھے جیسے وہ درد میں مبتلا ہو۔ ہر رات سونے سے پیشتر لڑکی کو دیوار کے پیچھے سے لوہے کے سپرنگ کی آواز سنائی دیتی۔ وہ ہولے ہولے جھول رہا ہوتا۔ عورت اسے جھلا رہی ہوتی اور چلا رہی ہوتی اور سسکیاں بھر رہی ہوتی۔

لوسیلا دی۔ ہوسی لوس
(فلپائن)

ظہور

اُسے اپنا جسم بدلتا ہوا محسوس ہوا۔ تقریباً ایک ماہ سے وہ اپنے آپ کو سمجھ نہیں پا رہی تھی کیوں کہ اُس نے اس طرح پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا چہرہ دیکھتی، چھوٹے سے ریت کے کنویں میں اور وہاں پانی میں اُس کا جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ ہوتا۔ یہ ریت کا کنواں اُس نے دریا کے کنارے بنایا تھا اور اُسے پہاڑیوں سے دوڑ کر آئے والے برابر کر چکے تھے۔ اُس نے اپنے نقش تو بدلے ہوئے نہیں دیکھے لیکن اس کے باوجود وہ یہ کیوں محسوس کرتی ہے کہ اُس کے چہرے کا تاثر بدل رہا ہے۔ وہ اپنے ہی سوال کا جواب نہ دے سکنے کے باعث اُلجھی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی نگاہ باریوں کی طرف کی۔ دوپہر کی چمکتی دھوپ میں اُن کے گھر کی چھت کا پتہ نہ چلتا تھا۔ دریا کے ساتھ والی سڑک کو جانے والا راستہ صاف تھا لیکن اُن کے گھر کی جانب جانے والے راستے پر بے شمار گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ہل چلانے کے لیے اُس کا باپ جو کراہو استعمال کرتا تھا وہ ابھی تک کنویں کے پاس آم کے درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے کھیتوں کا کام ابھی مکمل نہیں کیا۔ اُس نے فراغت سے سوچا لیکن ساتھ ہی ساتھ کپڑے بھی دھوتی رہی اور اُنھیں جلدی جلدی نچوڑتی رہی کیوں کہ گرمی بڑھ رہی تھی اور والدین کی واپسی سے پہلے اُسے دوپہر کا کھانا بھی پکانا تھا۔ تقریباً سارا باریوں کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے گیا ہوا تھا اور وُہ آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ابھی مارچ تھا لیکن دھان کاشت کے بعد سُوکھ گئی تھی اور اب

اُس کے سُوکھے ہوئے پودوں کو توڑنا پڑتا تھا۔ وہ لوہے کے پھالے سے کھیت کی زمین کے ٹکڑے ہوتے دیکھ سکتی تھی۔ اوپری زمین اپنی گھاس پھونس کے ساتھ پلٹ جاتی تھی اور اُس سے نچلی زمین سفید بھری بھری خاک میں بدل رہی تھی کیوں کہ گرمی سیاہ نمی کو چوس لیتی تھی۔ یہ سب کُچھ ایک مرتبہ کنویں پر بیٹھنے والی عورتیں بتا چکی تھیں اور ایسے قہقہوں کے ساتھ جو اُس کی سمجھ سے باہر تھے۔ زمین کو جڑی بوٹیوں اور کیڑے مکوڑے سے صاف کرنے کے لیے، جب کہ وُہ خشک اور گرم موسم میں کھلی پڑی ہو، اپریل کی اکا دکا بارش کی بجائے بہتر ہے کہ مئی کی شدید بارشیں ہوئیں اور اِن شدید بارشوں کو اُس نے یُوں پہچانا تھا کہ ناریل کے پتوں اور کمانسے کے چوڑے اور موٹے پتوں اور ان کے جو اولین چھینٹے پڑتے تھے وہ گویا آسمان سے برکت کا نزول تھے، جیسا کہ بڑی بوڑھیوں نے بتایا تھا، تو پھر فصل بہتر ہوتی تھی۔ اُس کے ذہن پر خاموشی کے درمیان، ایسے خیالات اور احساسات چھائے ہوئے تھے جن کو وُہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ جب وُہ نیلے آسمان کو دیکھتی، جہاں اُس پادری کے بقول، جو ماہانہ وعظ کے لیے آتا تھا، اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے زمین پر اچھی زندگیاں گزاری تھیں، خدا اور فرشتوں کی نہ ختم ہونے والی خوشگوار رفاقت ہے،

تو سب سے زیادہ تنہا محسوس کرتی۔ اُس کے والدین نے اُسے یقین دلایا تھا کہ جو کُچھ پادری نے کہا ہے وُہ سچ ہے اور وُہ دن بہ دن اُس سے دور ہو رہے تھے اور اب اُس کے لیے اُن سے کوئی سوال پوچھنا ناممکن ہو رہا تھا سوائے کاشتکاری اور گھریلو معاملات کے۔

حال ہی میں وہ کُچھ پوشیدہ قہقہوں میں بہت سکون محسوس کرتی جو کنویں یا دریا پر کھڑی عورتوں کے ہوتے۔ وُہ خاوندوں، بچوں، بیماریوں اور روزمرہ کی زندگی کے بارے میں باتیں کرتی چلی جاتیں۔ اب اُن کی غیر موجودگی میں وُہ دریا پار کے بانس کے جھنڈوں کی آواز زیادہ غور سے سنتی۔ تتلیاں جو اِدھر اُدھر اُڑتی پھرتی تھیں اور لوم ہوائے کی کلیوں پر بیٹھنے کی کوشش کرتی تھیں جو اُس کے لیے سایہ مہیا کرتا تھا، اُس کے خیال میں وہ اُسے سمجھنے اور درست بنانے کے لیے ایسا کر رہی تھیں۔ کانوں کو چیر دینے والی ٹاگوائی کی چیں چیں اُس کے دماغ میں اُترتی تھی، اور وہاں تک جاتی تھی جہاں ان کہے خیال تھے۔ وُہ اپنے انگوٹھوں کے ساتھ کھیلتی لہروں کے چھُونے سے بے حساب لطف حاصل کرتی۔ وُہ اس قدر راضی تھیں اور اُن کی قربت کا خوشگوار احساس اس پر چھا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُسے اس کمی کا احساس رہتا کہ وُہ صرف اُن کی

موجودگی ہی میں اُن کو جان سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُن کو یوں چُھو سکے کہ بعد میں بھی اُنھیں یاد کر سکے، جس طرح وُہ اپنے باپ کے چہرے کی نرمی کو یاد کرسکتی تھی!

ایک لمحے میں باپ کا تصور اُس کے ذہن میں آیا تو اُسے یاد آیا کہ اُس نے تو کبھی اُس کا چہرہ چُھوا ہی نہیں تھا!

یہ اُسی کا چہرہ تھا جو سب سے زیادہ اثر رکھتا تھا: صاف ستھرا اور ایماندار ایک ایسی نگاہ جو اس کے خوبصورت دل کا حال سناتی تھی۔ اُسے اس کی نرمی بھی یاد تھی۔ پتلا دُبلا لیکن مضبوط جسم کا وُہ ایک مہربان اور اچھی خصلت رکھنے والا شخص تھا اور وُہ اکثر اپنی ماں کی شکایت سنتی کہ تمام تکلیفوں کی وجہ وُہی ہے۔ نیک دل ہونے کے باعث اُس کی ماں کہتی تھی، وہ اپنے زمیندار کے ساتھ بحث نہیں کرتا تھا اور وُہ زمیندار فصل میں اُن کا حصہ مار لیتا تھا۔ ہم اُن کو اُس سے زیادہ کیوں ادا کریں جتنا کہ ہم نے اُن کا دینا ہے؟ اور پھر بڑے گھر میں بےشمار ایسے کام کیوں قبول کیے جائیں جن کے بارے میں پتا ہے کہ ان کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ اُس کی ماں اس بات سے بےخبر تھی کہ ہمسائے اُن کے جھگڑے کا تماشا دیکھنے کے لیے صحن میں جمع ہیں۔ ماں چیختی اور یوں چیختی جیسے خاندان میں کوئی بیمار پڑ گیا ہے۔ اگر کبھی اُس کا باپ بحث کرتا تو صرف وقتی طور پر، اور فوراً ہی اس پر معافی مانگ لیتا چاہے ڈان رامون کا اوورسیئر پابلو ہی کیوں نہ ہوتا۔ سنیورا اور سنیوریٹا رامون سیٹو: وہ نہ ہی کچھ بیان کرتا ہے اور نہ چھپاتا ہے۔ اپنے مالکوں کی موجودگی میں وُہ ہمہ وقت احمقانہ طریقے سے مسکراتا رہتا ہے اور اپنا بُوری ہیٹ دبوچے رکھتا ہے۔ وہ صرف سر ہلاتا رہتا ہے اور اُسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اُس نے کیا کہنا ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنی ماں کے غصے کو جائز سمجھتی لیکن جب وُہ اپنے باپ کا چہرہ دیکھتی، جس پر غصے کا سایہ تک نہ ہوتا، نہ ہی نفرت اور نہ ہی کسی قسم کی تلخی تو وُہ اپنے مالکوں کی طرف دیکھتی تاکہ کسی پر تہمت لگائی جا سکے۔ پھر اُس میں خوف اور فکرمندی کا لاوا اُبلتا جو اُس کے باپ تک پہنچتا۔ اور یہ کیسے ہوتا؟ اُسے کبھی پتہ نہ چلا۔ وہ اس بات پر بےحد جل بھن جاتی کہ ہمسائے اُس کے والدین کے جھگڑے سنتے ہیں، صرف اس لیے کہ یہ جان سکیں کہ اس دنیا میں اُن سے بھی زیادہ بدقسمت اور ناخوش لوگ موجود ہیں۔ اس کی پوری زندگی اُس کے گلے میں اٹکی ہوئی تھی اور ناآسودگی سے اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں کسی ایسی شے نے، جسے نام نہاد نہیں دیا جا سکتا، ناقابل بیان اذیت اور فکرمندی اُس کے اندر بیدار کی۔ اُس کی بےچینی گھر میں اور کھیت میں عیاں تھی بلکہ جب وہ

بات کرتی تو بھی پتا چل جاتا۔

بہت ساری چیزیں اور خیال اُس کے ذہن میں رقص کرتے اور اُس کے خوابوں میں آتے لیکن پھر بھی وُہ اپنے آپ کو کیمونو اور پاٹا ڈیونگ میں کنویں میں سے پانی بھرتے دیکھتی، دہقانی عورتوں کے ساتھ ہنستے ہوئے جب کہ وُہ بانس کی لمبی نالی کندھوں پر رکھ رہی ہوتی، اس کے پیشتر کہ وہ کھیتوں میں گرم سُورج تلے چلتی ہوئی گھر جائے۔ کاشت کے موقع پر دھان کی نیری گیلی اور بھاری ہوتی ہے اور پانی بھرے کیچڑ میں اُترنے کی خواہش رکھتی ہے۔ اور مغرب کی طرف سورج کا سفر دھان کے پودوں کے سائے سے ناپا جاسکتا ہے۔ نومبر تک ہوا فصل کے پکنے کی مہک سے بھاری ہو جائے گی۔ اگیتا ما کان، جو پلی پگ کے لیے بالکل مناسب ہوتا ہے، لیکن پابلو وہاں اُنھیں یہ یاد دلانے کے لیے ہوتا تھا کہ ان پکی فصلوں کو پلی پگ کرنے سے چوہوں اور کیڑوں مکوڑوں کا خطرہ ہوتا ہے اور وزن بھی کم ہو جاتا ہے۔ بوڑھے لوگ اپنے سر پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے ہلاتے۔ وہ کہتے: جب ہم نوجوان تھے تو رات کے کھانے کے بعد ہم چپکے سے چاندنی راتوں میں نکل جاتے تا کہ کچھ مکی کے پودے لا کر اُنھیں کوٹ کر پلی پگ میں تبدیل کیا جائے اور یہ سب کُچھ ہنسی مذاق اور گانے بجانے کے ساتھ ہوتا۔ اوورسیئر جانتے تھے یہ لوگ چاندنی راتوں میں نکل جاتے ہیں لیکن وُہ ہمارے طرفدار تھے اور زمیندار کو بھی نہیں بتاتے تھے۔ اور اب تو اوورسیئر زمیندار سے بھی زیادہ لالچی ہیں جیسے وُہ خود زمین کے مالک ہوں۔ ذرا پابلو کے گھر کو دیکھو۔ اُس کے بچے شہر کے مہنگے ترین سکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ دسمبر تک پکتے ہوئے سٹے غروبِ آفتاب کے وقت سونے جیسے سنہری ہو جاتے تھے۔ لیکن کٹائی اور کاشت میں دقت یہ تھی کہ ہمہ وقت وہ حساب ذہن میں رہتا جو بڑے گھر کی حساب کی کاپیوں میں درج تھا اور اس محنت کے باوجود وُہ جُوں کا تُوں رہتا تھا۔ اگر ایک نیا خانہ نہ بنایا گیا تو سانتو نینو کے پاس کرسمس پر چندہ دینے کے لیے بھی کُچھ نہ ہوگا۔

اُس کے بکھرے ہوئے خیالات اُسے گیلے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس واپس لے آئے۔ اُس کا خیال تھا کہ وُہ مستقبل کو دیکھ رہی ہے لیکن کیا یہ حال نہیں ہے؟ ماضی تو اب بوڑھے لوگوں کی خمیدہ کمر کی طرح اُن کی چُبھتی ہوئی تیز نظر میں ہے۔ چیزوں کا ہو بہو وُہی ہونا اُس کے بدن کی تبدیلی کے احساس کو اور شدید کرتا تھا۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ اُسے یکدم یہ احساس اس وقت ہوتا تھا کہ جب اُسے کوئی دیکھتا تھا۔ اُس نے یاد کیا کہ سان رفائل کے جشن کے موقع پر

پچھلے مہینے کیا ہوا تھا۔ جب پکارنے والے نے جشن کی ملکہ کا شاعرانہ تعارف کروایا تھا:

اِن ڈے۔

آم کے درخت کی طرح پتے نکالتی ہے۔

اُس کا بدن۔

ایک پھول کی طرح کِھل رہا ہے۔

اُس نے اپنے آپ کو شاعری کی موسیقی میں گم کر دیا تھا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ سب کچھ اُس کے لیے کہا جا رہا ہے، چنانچہ اُس کے احساسات، اس کے بدن اور اُس کا عورت پن ان خوبصورت تعریفوں سے کھلنے لگا تھا۔ اُس وقت کے بعد اُسے پتا چلا کہ اُس کی آواز بدل رہی ہے اور وہ ایک ہی شے کو مختلف طریقوں سے دیکھتی تھی، مختلف چالوں سے چلتی تھی۔ اُس نے اپنے بالوں کا طرزِ آرائش بدل لیا تھا۔ اُس کے لباس جسم پر تنگ ہو گئے تھے۔ دوسروں کے پاس اتنا کچھ ہے تو میرے پاس اتنا کم کیوں ہے؟ پُورا خاندان جتنی بھی کوشش کرتا، پورا گاؤں جتنی بھی محنت کرتا فصل زیادہ نہ ہوتی، اتنی ہی رہتی۔ بارش زیادہ ہو جاتی، سورج زیادہ جلاتا، بڑے گھر میں حساب کتاب بڑھ جاتا اور عورتیں زیادہ گہرے سانس بھرتیں۔

جیسے جیسے اُس کا ساتھی عورتوں اور چیزوں کو دیکھنے کا طریقہ بدل رہا تھا ویسے ہی لوگ بھی اُسے ایک مختلف انداز سے دیکھتے تھے۔ اُس نے نوٹ کیا کہ نوجوان لڑکے اُس کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں اور دیر تک دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر بدھ کے روز، جو شہر میں خریداری کا دن ہوتا ہے، اور وہ اپنے بہترین اور اکلوتے لباس میں ذرا بن ٹھن کے جاتی ہے۔ ایسے اشاروں سے وہ پریشان ہو جاتی ہے اور وُہ اپنی نگاہیں پھیر لیتی، شرمندگی اور خفت کی وجہ سے۔ اب اِس تنہائی میں اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے والدین پر چیخے بلکہ ہمسایوں اور پُوری دنیا پر تاکہ انھیں معلوم ہو سکے اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اُس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ دُور، بہت دُور، دوپہر کی خیرگی میں اُن کا گھر جیسے اور دور ہو رہا تھا۔ اُس کے آس پاس تو مرجھائے ہوئے پتے بھی نہیں سرسراتے تھے۔ سورج بہت اوپر آ چکا ہے اور گرمی گنجی سی گھاس میں گم ہوتی تھی اور کچھ آبی پودے ابھی تک زندہ تھے۔ گرمی دریا کے پانی میں بھی سرایت کر چکی تھی اور لوم ہوائے کے سایے میں بھی اُس کی کھال میں چُبھتی تھی۔ اُس نے سیٹی بجائی اور خوش ہو کر ہوا کو پکارا لیکن ناریل اور کوگون کے پتے بھی ساکت تھے۔ اس نے ایک ناریل کے خول کی مدد سے اپنے بدن

کو دریا کے پانی سے کئی مرتبہ بھگویا۔ لگتا تھا اُس کے بدن سے دھواں اُٹھتا ہے اور پھر ایک ایسی ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے جس سے وہ پہلے سے بہتر طور پر کام کرنے کے قابل ہو جائے۔

لیکن تھوڑی دیر میں وہ ایک مرتبہ پھر گرمی کی وجہ سے بھٹکنے لگی۔ اُس کا دماغ بے چین تھا اور بار بار ماضی کی جانب لوٹتا تھا۔ اُسے پچھلے ہفتے کی وُہ دوپہر یاد آئی جب رامون سیٹو یک دم واپس آ گیا تھا۔

وہ اُس کے سامنے والے صحن میں جھاڑو دے رہی تھی جب اُس نے گھوڑوں کے بھاری سانسوں کی آواز سُنی۔ دُھول کے ایک بگولے میں دو گھوڑے باڑ کے ساتھ آ کر رُک گئے۔ اُس نے دُھول سے بچنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جب اُنھیں کھولا تو اُس کے سامنے ایک نوجوان اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وُہ یک دم خوفزدہ ہو کر وہاں سے اُٹھ بیٹھی اور اُسے یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ ایسا کر رہی ہے۔ جب وُہ کچھ ہوش میں آئی تو گھر کے پچھواڑے میں باورچی خانے کے پاس تھی۔ اُوپر اُس کا باپ کھڑکی کی جانب بھاگ کر آیا اور فرش کا بانس آواز دینے لگا۔ اُس نے سُنا کہ وُہ اُس کی ماں سے چیخ کر کہہ رہا ہے: ''بیٹنے ------ بیٹنے ------ سینوریٹو'' اب کھڑکی کی جانب اُس کی ماں بھاگی اور باپ سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

''آنڈو، تم نے ایک خزانہ چھپا رکھا ہے''۔ رامون سیٹو کی پُرمسرت آواز اُس تک پہنچی۔

''کیا بات ہے سینوریٹو؟'' اُس کے باپ کے سوال میں پریشانی تھی۔

''میں نے کہا ایک خزانہ چھپا کر ------'' اُس کی صرف اتنا فقرہ سُنا اور بقیہ سرگوشی میں گم ہو گیا۔

''سینوریٹو ------ ابھی نہیں''۔ اُس کے شعور میں اُس کے باپ کی ڈری ہوئی آواز ایک نیزے کی طرح پیوست ہو گئی۔

''اچھا تو پھر میں دوبارہ آ جاؤں گا۔'' رامون سیٹو نے قہقہہ لگا کر پُورے یقین سے یہ فقرہ کہا۔ اُس نے دیکھا کہ دونوں مرد گھوڑوں پر سوار ہو گئے ہیں۔ رامون سیٹون کے پالش شدہ جوتے سورج کی کرنوں سے چمکے، گھوڑے کے بدن پر اُس کی چابک کا وار بھاگتا ہوا گھوڑا، دُھول کا بادل۔ یہ سب کچھ یوں غائب ہو گیا لیکن اس کی تصویر ایک خواب کی طرح پیچھے رہ گئی۔

اُس کا باپ بنچ پر گر گیا اور بڑی دیر تک کندھے جھکائے بیٹھا رہا۔ وُہ جھاڑو دیتی رہی تھی اور رامون سیٹو کی آمد کا راز اُسے سُست بنا تا تھا۔ اُس نے اپنے باپ سے یہ نہیں پُوچھا کہ وُہ کیا چاہتا تھا کیوں کہ اُس نے اُسے بے حد بے دلی کے ساتھ اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ ''چیٹو کیا چاہتا تھا؟'' اُس نے اپنی ماں کو کہتے سُنا۔ لیکن اُس نے باپ کا جواب نہ سُنا۔ لگتا تھا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اُس نے سُوکھے ہوئے پتے اور آم اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے اُسے آگ لگا دی۔ اُس کا دل اور دماغ پرسکون ہو رہے تھے۔ اِسی وقت اُس نے اپنے باپ کو گُنن ٹنگ اور مَیال لیے باہر جاتے دیکھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا کیلے کے جُھنڈ کی طرف گیا۔ وہ بہت دیر تک کیلے کے ایک تنے کے سامنے گُم سُم کھڑا رہا اور بھاری بھاری سانس لیتا رہا۔

یک دم اُس نے گُنن ٹنگ کو نکال کر کیلے کے ایک درخت کو کاٹ دیا اور پھر چڑھتے ہوئے سانس کے ساتھ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ سفید سفید گُودا ہر طرف اُڑنے لگا۔

اور اب بھی، دریا کے کنارے، اسے یاد تھا کہ وہ کتنی خوفزدہ ہو کر گھر کی جانب بھاگی تھی، اپنی ماں کو پکارتی ہوئی اور پھر اُس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے صحن میں اپنے باپ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اُس کی ماں بھاگتی ہوئی اُس کے پاس نیچے چلی گئی۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے باپ نے کیلے کے تنے کو کاٹنا بند کر دیا ہے۔ وُہ بانس کے ٹکڑوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور گُنن ٹنگ کو احتیاط سے میان میں ڈال لیا۔ پسینہ اُس کے چہرے سے بہتا تھا اور وُہ یہ نہ جان سکی کہ شاید وُہ بھی اُن کی طرح رو رہا تھا۔ اُس نے ماں کو آنکھیں پُونچھتے دیکھا۔

اُس کے والدین شام کو واپس اوپر آئے۔ اُس نے رات کے کھانے کے لیے چاول بنا رکھے تھے۔ ایک نامعلوم کانٹے کی طرح خاموشی اُسے چُبھتی رہی۔ اُس کا بدن کانپ رہا تھا اور وُہ جاننا چاہتی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے لیکن اُس نے والدین سے استفسار نہ کیا۔ اُسے اندازہ تھا وُہ جو کُچھ کہہ رہے تھے ایک راز تھا۔ ایسا راز جو اُسے بتا دیا جائے تو بھی وُہ جان سکے! اُس کی ماں رات کا کھانا بنانے میں اُس کی مدد کرتی رہی۔ باہر اُن کی چھوٹی سی بیٹھک میں اس کا باپ بانس کے بنچ پر آرام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھامس اور برنگ نے گھر میں چھائی خاموشی کا احساس کیا اور کھانے کے بعد کوئی سوال پُوچھے بغیر سو گئے۔

وُہ اچھی طرح سے نہیں سو سکتی تھی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ کیلے کے درخت کے

سفید چھلکے اُڑ رہے ہیں اور اُن پر چمکتی دھات کے وار ہو رہے ہیں اور پھر وُہ راموں سیٹو کی سفید جلد میں بدل رہے ہیں۔ اُس نے اپنی نیند میں چابک کی آواز سُنی اور سموں کی دھمک سڑک پر پڑتے ہوئے اُس کے کانوں میں اُتری۔ صُبح وُہ دیر سے اُٹھی اور تنہا ناشتہ کیا۔ اُس کے والدین کھیتوں کو جا چکے تھے اور لڑکے بھینسوں کو چراگاہ میں چرا رہے تھے۔ پہلی بار اُس نے اپنی تنہائی محسوس کی۔ وُہ چاہتی تھی اپنا خواب کسی اور کو سنائے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وُہ ٹیا سا مانگ کو ملنے سا مبا گ گولوب گئی جہاں املی کا ایک تناور درخت طوفان کی وجہ سے اُکھڑا پڑا تھا۔ لیکن ٹیا سا مانگ شہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اور اپنے دروازے کے سامنے بس کا انتظار کر رہی تھی، وہ اپنی بہن کو ملنے جا رہی تھی جو اس لیے گھر سے بھاگ گئی تھی کہ اُس کی ماں نے اُسے شہر میں قسمت آزمائی کی اجازت نہیں دی تھی۔ بڑی بہن پلر اب ایک لباس بنانے والی فیکٹری میں کام کرتی ہے اور رات کو سکول جاتی ہے۔ وُہ ٹیا سا مانگ سے پلر کی کہانیاں سُن کر بہت خوش ہوتی تھی۔ جو خوش حالی پلر کی منتظر تھی اُس کے خیال ہی سے اسے بھی بہت خوشی ہوتی تھی۔

کپڑے نچوڑتے ہوئے اُس نے پلر کے کام کے بارے میں سوچا کہ وُہ کیا کرتی ہو گی: خود کمائی کرنا اور پھر سکول میں بہت سارے دوست بنانا اور شہر میں ہونا۔ جو وہاں گئے تھے کہتے تھے وہاں سکول اور سٹور بہت بڑے بڑے ہیں۔ سینما گھر، ریستوران اور بیوٹی پارلر خوب ٹھنڈے ہیں اور طرح طرح کے کھیل تماشے ہیں۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وُہ ٹیا سا مانگ کو مل کر شہر کے بارے میں اور بہت کُچھ پُوچھے گی۔

اُس کے خیالات اس وقت بکھر گئے جب دریا کے پار بانس کے پودوں میں سے کچھ آوازیں آئیں۔ کیچڑ سے لت پت ایک بھینس بانس کے جُھنڈ میں سے برآمد ہوئی۔ وُہ سیدھی دریا کے کنارے گئی اور پانی پینے کے لیے رُک گئی۔ ایک بڑا پتھر اس کی پُشت پر زور سے لگا۔ وہ کنارے سے ہٹی اور ایک گڑھے میں گر گئی۔ لنگڑاتی ہوئی وہ ناریل کے اُن درختوں کی طرف گئی جو کھیتوں کے ساتھ ساتھ تھے۔ جب وُہ گڑھے میں گری تو دوپہر کی خاموشی میں ایک بُلند قہقے کی آواز سنائی دی۔

جب اُس نے یہ آواز سُنی تو ایک تیر سا اُس کے سینے میں اُترا اور کُچھ اُس کے بدن پر رینگنے لگا۔ خوفزدہ ہو کر اُس نے آس پاس دیکھا۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ اُس کے والدین

پچھلے اتوار کی دوپہر کو کیا گفتگو کر رہے تھے اور اُس کے بعد اتنے روز چُپ کیوں رہے تھے۔

اُس کے ذہن کی تاریکی میں طرح طرح کے منور اور کئی سورج کی طرح روشن ستارے چمکنے لگے اور اندھیرا کم ہونے لگا۔ یہ روشنی اُس کے احساسات میں کھب گئی۔ اُس کے دماغ میں، نظر میں اور پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس نے اُسے عورت پن کا پہلی بار احساس دلایا۔ اِس اندر کی روشنی نے اُس کی سوچ کو راہ دکھائی اور وُہ اس راہ پر چل نکلی تاکہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے۔

اُس نے آس پاس نگاہ کی۔ یہ علاقہ بالکل ننگا تھا اور وہاں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وُہ اپنے آپ کو چُھپا سکتی۔ لیکن اب وُہ کُچھ سمجھتی ہے اس لیے خوفزدہ نہیں ہے۔ اور اُسے علم ہے کہ اُس نے کیا کرنا ہے۔ دائیں جانب، ذرا نیچے، دریا قدرے گہرا ہے۔ وہ جلدی سے وہاں پانی میں کُود گئی جہاں اِنیام کے درخت کی ایک ٹہنی جُھکی ہوئی تھی۔ اب وُہ سُوکھے پتوں کو کچلتے ہوئے بوٹوں کی آواز سُن رہی تھی جو راستے پر چلے آرہے تھے۔ وُہ ہراساں ہو کر پرواز کر جانے والے پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سُن سکتی تھی۔ ٹڈے پُھدک رہے تھے اور تتلیاں اِدھر اُدھر اُڑتی جارہی تھیں اور اب ٹہنیوں اور پتوں پر برستی چابک کی آواز آرہی تھی۔ کیا اُسے دیکھ لیا گیا تھا! شاید وُہ بانسوں کے جُھنڈ میں پوشیدہ ہونے کے باعث نظر نہ آئی ہو۔ لیکن کنارہ تو ننگا تھا اور گھاس اور پودے گرمی سے جُھلس کر سُوکھ گئے تھے حالانکہ موسم گرما ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ جب اُس نے راستے پر چمکتے بُوٹوں کو دیکھا وُہ پانی کے نیچے چلی گئی۔ وہ وہاں کتنی دیر دم روکے ٹھہری رہی اس کے بارے میں اُسے کچھ علم نہ تھا۔ اُس کی چھاتی سانس لینے کے لیے پھٹی پڑی تھی۔ جب وُہ برداشت نہ کر سکی تو سطح پر آگئی۔ گرچہ سورج چمک رہا تھا لیکن وُہ اُسے سیاہ دکھائی دیا اور جب اُس کے اوسان بحال ہوئے تو اُس نے دیکھا کہ وُہ بالکل اکیلی ہے۔ وُہ کنارے پر چڑھ گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ بدن سے چمٹا ہو گیلا لباس سُورج کی آگ تلے بھی ٹھنڈک دے رہا ہے۔ وُہ سڑک کی جانب تیزی سے بھاگنے لگی۔ فٹ پاتھ سے جب وُہ سڑک کے تارکول پر آئی تو اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کا گھر اور پورا گاؤں اس قدر پیچھے رہ گئے تھے کہ نظر نہیں آرہے تھے۔ پھر مُڑے بغیر وہ ویران جنگل کے راستے سامباگ۔ کولوب کی جانب روانہ ہو گئی۔

کیتھرین سم
(سنگاپور)

پوئے آہ موئے

آئرین کے ساتھ ایک برس گزارنے کے بعد اس کی بے چارگی اور بے ہنگم پن ختم ہوئے اور پوئے آہ موئے اپنے مالک کو اپنی دکھ بھری زندگی کے بارے میں بتانے کے قابل ہو گئی۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھی اور کبھی سکول نہیں گئی تھی اور جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا وہ اپنے والدین کے چکن فارم میں ان کی مدد کیا کرتی تھی۔ یہ فارم چھوٹے سے گاؤں ''الیس'' میں تھا جو جوہور بھارو کے نزدیک واقع تھا۔ اس کی ماں کو سانس کی تکلیف تھی اور وہ سارا دن بستر پر پڑی رہتی تھی۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ہوش سنبھالتے ہی گھر سے بھاگ گئے تھے۔ وہ نہ صرف قسمت آزمانے کے لیے گھر سے بھاگے تھے بلکہ وہ باپ کے قہر سے دور ہونے کے لیے بھی وہاں سے چلے گئے تھے۔ باپ کے بارے میں اس نے آئرین کو بتایا کہ اس کی آنکھیں پل بھر میں سرخ ہو جاتی تھیں اور وہ ایک سخت گیر بدمزاج شخص تھا جس نے خاندان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو ہمیشہ پیٹتا رہتا۔ ایک مرتبہ اس کی چھوٹی بہن کو ہسپتال لے جانا پڑا کیوں کہ اسے سر میں شدید ضرب آئی تھی۔ ماں بیمار تھی تو بھی اسے مار پڑ جاتی۔ پوئے آہ موئے کے ماتھے پر بھی ضرب کا نشان موجود تھا (جو وہ بالوں کو آگے کر کے چھپا لیتی تھی) اور اس کا بایاں کندھا اب بھی کبھی کبھار دکھتا تھا۔ ایک روز ناخوش اور وحشی بوڑھے نے جنگل میں جا کر اپنے آپ کو ایک درخت سے پھانسی دے لی۔ چند دنوں بعد ماں بھی مرگئی اور بچے اکیلے رہ

گئے۔

دونوں بھائی تھوڑی دیر کے لیے واپس آئے اور کچھ مالی مدد کی کیوں کہ سنگاپور میں دونوں کے پاس اچھی ملازمتیں تھیں۔ ایک تو عمارتیں بنانے کے کام سے وابستہ تھا اور دوسرا ایک الیکٹرانک کی فیکٹری میں کام پر لگا ہوا تھا۔ ایک بہن آہ کم، آہ موئے سے چھوٹی تھی۔ وہ جنازہ ٹھکانے لگتے ہی بھاگ گئی۔ آہ موئے، آہ کم کے بارے میں بہت سنجیدہ اور بہت ہی دکھی دکھائی دیتی تھی۔ آئرین کو یہ جان جانے میں دیر نہ لگی کہ آہ کم کسی بڑے قصبے کے چکلے میں کام کرنے کے لیے گھر سے بھاگی تھی۔

آہ موئے نے گھر کا انتظام سنبھال لیا۔ دو چھوٹے بھائی اور دو چھوٹی بہنیں اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس نے کچھ عرصہ قبل جوہور بھارو کے ایک ریسٹوران میں برتن صاف کرنے کا کام کیا اور اس دوران وہ ہر اتوار کو گھر واپس آ کر بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی۔ دونوں لڑکے سکول جاتے تھے اور لڑکیاں گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔ فارغ اوقات میں وہ چھوٹے موٹے کام کر کے آہ موئے کی رقم میں کچھ اضافہ کر دیتیں۔ وہ پنساری کی دوکانوں کے لیے کاغذ کے لفافے بناتیں۔ یا پھر باداموں کو رات بھر بھگو کر اگلی صبح چھلکے اتارتیں تاکہ تیل میں تلنے سے یہ بادام ذرا خستہ ہو جائیں۔ پانچ سیر باداموں کے چھلکے اتارنے کا ایک ڈالر ملتا۔ آہ موئے نے کبھی اپنے ہاتھوں کے کھردرے ہو جانے یا ان پر چھالے پڑ جانے کی شکایت نہ کی اگرچہ وہ دیکھ رہی تھی کہ برتن دھونے کی وجہ سے اس کے ناخن اور جلد ہمیشہ کے لیے برباد ہو رہے ہیں۔ البتہ وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے بارے میں بات کرتی تو آبدیدہ ہو جاتی۔ ان میں سے ایک کو تو ابھی سے سانس کی تکلیف تھی، اپنی ماں کی طرح۔ ان سب کی کل آمدنی بھی بہت کم، ناکافی اور ہمت شکن تھی۔ آہ موئے نے ایک رشتے دار کی نصیحت پر سنگاپور جانے کا فیصلہ کیا تھا جہاں گھریلو ملازموں کو دوگنی تنخواہ ملتی تھی بلکہ کئی مرتبہ تین گنا اور دیگر مراعات اس کے علاوہ تھیں۔

''جب وہ پہلی بار میرے ہاں کام کرنے کے لیے آئی تو'' آئرین اپنی بہترین دوست بی لنگ کو بتایا کرتی، ''میں اسے ملازم رکھنے پر تیار نہ تھی۔ اس نے ایک صبح میرے دروازے پر دستک دی۔ یہ بہت دُبلی اور لاغر تھی۔ اس زمانے میں مجھے وہ بیوقوف ملازمہ بہت تنگ کر رہی تھی، تم تو اسے جانتی ہو، وہی جو کبھی ڈاکٹر نگ کے ہاں کام کرتی تھی۔ تو جناب آہ چنگ جو تھی وہ ہمیشہ چھٹی مانگتی رہتی اور اکثر فون کر دیتی کہ اس کا بیٹا بیمار ہے اس لیے وہ نہیں آ سکتی

یا اس کی دادی مرگئی ہے یا ایسی ہی کوئی اور بات ۔ بہانے پر بہانہ ۔ اس صبح میں بے حد پریشان تھی کیوں کہ کینی کی دیکھ بال کرنے والا کوئی نہ تھا اور میں گھر کے فاضل کاموں کی وجہ سے بے حد تھک چکی تھی ۔ چنانچہ میں نے اسے رکھ لیا اور صاف صاف بتا دیا کہ یہ عارضی نوکری ہے ۔ یہ سن کر اس کا لاغر اور فاقہ زدہ چہرہ دمکنے لگا ۔ اس نے تنخواہ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا ۔ وہ فوراً ہی کام میں جت گئی ۔ میں بے حد حیران ہوئی کہ ایک ایسی لڑکی ، جس نے کبھی گھریلو ملازمہ کے طور پر کام نہیں کیا تھا ، اتنی ماہر کیسے ہوگئی ۔ وہ فرش صاف کرتی ، فرنیچر جھاڑتی ، باغ میں بکھرے پتے سمیٹتی ، کتے کی گندگی صاف کرتی ۔ اور یہ سب کچھ وہ بنا کہے کرتے ۔ مجھے تو بے حد حیرت ہوتی ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ سب کچھ بالکل خاموشی سے کرتی ، بغیر آپ کے راستے میں آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل بے آواز ۔ تمھیں وہ ملازمہ تو یاد ہوگی ، وہ ٹوچیو عورت جو بہت کھردری تھی اور جس کے دانت سونے کے تھے ، وہ اتنا شور مچاتی تھی کہ سب کو پریشان کر دیتی تھی ۔ میں نے بون سے کہا کہ تم اس لڑکی کو کام کرتے دیکھو اور ایک ہفتے کے بعد ہم دونوں میں اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ یہ لڑکی ایک خزانے سے کم نہیں ۔

پوئے آہ موئے وہیں مقیم رہی ۔ وہ خوش نظر آتی تھی اور اس کی صحت اور شکل دونوں بہتر ہو رہے تھے ۔ آئرین نے تیزی سے اس کی تنخواہ بڑھانی شروع کر دی اس ڈر سے کہ وہ کہیں اور نہ چلی جائے ۔ جب بچہ پیدا ہوا تو آئرین کا خیال تھا ایک سترہ برس کی لڑکی ایک چھوٹے بچے کی دیکھ بھال اچھی طرح سے نہ کر پائے گی ۔ لیکن پوئے آہ موئے نے چپکے سے اس کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی درخواست کی کہ صرف کپڑے دھونے کا کام کسی اور کے سپرد کر دیا جائے ۔

'تم یقین نہیں کرو گی کہ اس نے نہ صرف چھوٹے نکی بلکہ کینی کی بھی پوری دیکھ بھال کی ۔ البتہ میں کبھی کبھار بچے کے لیے دودھ تیار کر لیتی تھی کہ وہ رات کو پی سکے لیکن باقی سب کچھ آہ موئے کرتی تھی ۔ وہ بچے کو کھانا کھلاتی ، اسے نہلاتی ، بوتلوں کو گرم پانی سے دھوتی ، اس کا کمرہ صاف ستھرا رکھتی اور اس کے ساتھ ہی وہ کینی کے لیے بھی وقت نکال لیتی ۔ میرا کینی تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا ۔ وہ تو میری نسبت اس کے ساتھ زیادہ چمٹتا اور جہاں جاتی اس کے پیچھے جاتا ۔ بعض اوقات تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے کہ اس کے پاس کھانے اور نہانے کے لیے بھی وقت نہ ہوتا تھا لیکن وہ بالکل پروا نہ کرتی ۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ بس ٹھیک ہے اور بالآخر سب کچھ ٹھیک ہو

جاتا۔ وہ گھر میں ہوتی ہے تو میں دفتر میں بے فکری سے بیٹھتی ہوں۔ کیرن کی طرح نہیں کہ ہر پانچ منٹ کے بعد گھر فون کر کے ملازمہ سے پوچھو کہ بچوں کو دودھ پلا دیا ہے کہ نہیں۔ سودا سلف لے آئی ہو یا نہیں۔ میں تو سب کچھ اس پر چھوڑ دیتی ہوں۔ وہ تو ہیرا ہے۔

آئرین پوئے آہ موئے کی خوبیاں بار بار بیان کرتی۔ ایک تو وہ اس لڑکی کی جائز تعریف کرنا چاہتی تھی دوسرے وہ ان لوگوں پر ترس کھاتی جن کے پاس اتنی اچھی ملازمہ نہیں ہوتی۔

پوئے آہ موئے، آئرین بڑے جوش سے کہتی، بڑی صاف ستھری ہے۔ وہ گھر کی ہر چیز کی مکمل صفائی کرتی ہے۔ کرسیوں کی پشت اور ان کا نچلا حصہ، میری ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کا پچھلا حصہ، بچوں کے کھلونوں کی شیلف، میرے نوادرات۔ اور تمھیں پتہ ہے کہ نوادرات کو صاف کرنا کتنا مشکل کام ہے کیوں کہ ان پر بہت باریک کھدائی ہوتی ہے۔ وہ ایک تیلی پر کپڑا لپیٹ کر انھیں صاف کر لیتی ہے۔

آئرین کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانہ نہ تھا جب مسز کوان نے اپنی کاہل ملازمہ کی عادتوں کے بارے میں اسے بتایا۔ وہ خوشی اور مسرت سے ہنستی جا رہی تھی۔ کناروں پر دودھ، کافی یا اوولٹین کے دھبے صاف دکھائی دیتے۔ اور ایک روز جب مسز کوان نے موقع پر جا کر ہر شے کو جانچا پرکھا تو معلوم ہوا باورچی خانے کے دروازوں میں لال بیگوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔

آئرین کہنے لگی: ''میری آہ موئے تو باورچی خانے کو بالکل چمکتا دمکتا رکھتی ہے۔ بلکہ میں تو خود کچھ اتنی صاف ستھری نہیں ہوں کئی چیزوں کو ادھر ادھر رکھ دیتی ہوں لیکن آہ موئے انھیں فوراً اُٹھا کر ان کی مخصوص جگہ پر رکھ دیتی ہے۔''

''تم بہت خوش قسمت ہو۔ ان دنوں ایک اچھا ملازم مل جانا تو بہت ہی حیرت کی بات ہے۔'' مسز کوان نے کہا۔ ''میری ملازمہ تو سست ترین بھینس ہے جو ذرا سا بھی زیادہ کام نہیں کر سکتی۔ کسی مہمان کی وجہ سے ایک پلیٹ سے بھی زیادہ صاف کرنی پڑ جائے تو اس کا منہ لٹک جاتا ہے۔''

آئرین ایک مرتبہ پھر آہ موئے کی خوبیوں پر روشنی ڈالنے لگی: کیسے وہ اپنی مرضی سے اپنے فرائض سے بڑھ کر کام کرتی تھی۔ آئرین نے کھڑکی کے اس پردے کے بارے میں تفصیل بیان کی جو آہ موئے نے اپنی مرضی سے بنا کر وہاں لٹکا دیا تھا اور ٹیلی ویژن لاؤنج کے گدوں کے

لیے جو نئے غلاف اس نے بنائے تھے اور لڑکے کی نیکر پر جو ڈانلڈ ڈک اور مکی ماؤس کے کارٹون اس نے کاڑھے تھے اور ایک اتوار کو جو اس کی چھٹی کا دن تھا اس نے ننھے نکی کے کھیلنے کے لیے ایک نرم سی بلی بنائی تھی۔

''پھر تو تم اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتی ہوگی؟'' اس کے ساتھ کام کرنے والی مسز چندرا نے کہا۔ اور یہی وہ موقع تھا جب آئرین اپنی فراخ دلی کے کئی قصے سنا سکتی تھی۔ صرف آہ موئے ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان بھر کے بارے میں بھی۔ اس کے علاوہ جب اس نے آہ موئے کی تنخواہ کے بارے میں بتایا تو سبھی حیران رہ گئے۔ پھر اس نے اپنی بے شمار عنایتوں اور کرم فرمائیوں کے بارے میں بتایا: چینی نئے سال کے آغاز پر جو خوبصورت انگ پو اسے تحفے کے طور پر دیا گیا، کپڑوں، جوتوں، میک اپ کا سامان اور چھوٹے چھوٹے تحفوں کا ذکر ہی کیا جو آہ موئے کو دن رات ملتے رہتے تھے اور کھانے کی وہ اشیا جو آہ موئے کو اس کے بہن بھائیوں کے لیے اکثر ملتی رہتی تھیں۔

''اور جہاں تک خوراک کا تعلق ہے''، آئرین نے جان بوجھ کر اپنی سخاوت کا ذکر چھیڑا، ''وہ سبھی کچھ کھاتی ہے جو ہم کھاتے ہیں بسکٹ، شربت، کیک اور پھل وغیرہ اور ہاں سیخون پر بھونا ہوا گوشت بھی۔ لیکن آہ موئے بہت شرمیلی ہے اور خود سے کوئی چیز نہیں لیتی اور ہمیں اکثر اصرار کرنا پڑتا ہے۔ اور اب جو تم لوگ اسے اتنا صحت مند دیکھ رہی ہو تو ذرا تین برس پہلے دیکھتیں جب یہ ملازمت کی تلاش میں ہمارے یہاں آئی تھی۔ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اب تو خیر بہت خوبصورت ہے۔ اس کے بال اور رنگت بہت بہتر ہوگئی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس کے چہرے پر تھوڑا سا میک اپ کر دیا، میرا خیال ہے اس روز یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی تھی۔ یقین کرو یہ اتنی زبردست لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں! یہاں تک کہ بون نے بھی خاص طور پر تعریف کی۔ اور جب میں نے اسے بتایا کہ بون نے کیا کہا تھا تو یہ باقاعدہ شرما گئی تھی۔''

آئرین نے اعتراف کیا کہ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ آہ موئے کی شادی ہو جائے گی۔ عام طور پر یہ لڑکیاں جوانی میں شادی کر لیتی ہیں اور آہ موئے تو انیس برس کی ہو چکی تھی۔ ایک چچی اس کے رشتے کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ لڑکا ایک چھوٹے سے کاروبار کا مالک ہے۔ لیکن میں نے اپنی آہ موئے کا ذہن بدل کے رکھ دیا ہے۔ آئرین نے پورے یقین

سے کہا'' میں نے اسے کہا ہے کہ یہ بیوقوفی مت کرنا۔ ذرا اپنی سہیلیوں کو دیکھو جو سولہ سترہ برس کی عمر میں شادی کر بیٹھی تھیں۔ وہ بچے پر بچہ پیدا کر رہی ہیں اور ان کے سسرال والے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں۔ بیس برس کی عمر میں وہ چالیس کی لگتی ہیں اور ان کے پاس اپنا ایک دھیلا بھی نہیں۔ ذرا آہ سِھم کو دیکھو جس نے چچی کھو کی ملازمت چھوڑنے کی حماقت کی تھی۔ اب وہ اتنی موٹی اور بھدی ہے اور اس کے تین بچے ہیں اور چوتھا بھی آرہا ہے۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو بہت بُرے حال میں تھی اور میں نے ترس کھا کر اسے پانچ ڈالر دے دیے لیکن تم تو اچھی بھلی خوشحال ہو۔ تمھاری تنخواہ بہت اچھی ہے اور تمھیں اس میں سے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا کیوں کہ جو کچھ تمھیں چاہیے وہ سب یہاں سے مل جاتا ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمھاری کتنی سہیلیوں کے پاس اتنے پیسے ہیں اور اتنا آرام ہے؟ اس کے علاوہ تم ابھی نوجوان ہو۔ فی الحال کام کرتی رہو۔ شادی کرنے تک تمھارے پاس خاصی رقم جمع ہو جائے گی۔ پھر تمھارے سسرال والے تم سے نفرت نہیں کریں گے۔''

''اور وہ میری نصیحت پر عمل کر رہی ہے'' آئرین نے جیسے اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

''وہ اس سبزی والے کو گھاس نہیں ڈال رہی جو سبزی فروخت کرنے کے بعد اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ بس پانچ برس تک آہ موئے میری پاس رہ جائے۔ پھر میرے بچے بڑے ہو جائیں گے۔''

مسز کوان نے بڑے طریقے سے ایک مشورہ دیا کہ کہیں آہ موئے اپنی اہمیت کو جانتے ہوئے کوئی ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے۔ مسز کوان ایک ایسی ملازمہ کو جانتی تھی جو اپنی اہمیت سے بخوبی واقف تھی اور ہر ماہ کسی نہ کسی بہانے ملازمت چھوڑ جانے کا ارادہ ظاہر کرتی تھی اور اس کے نتیجے میں یا تو اس کی تنخواہ بڑھائی جاتی یا پھر تحفے تحائف دے کر اسے روکا جاتا۔

''نہیں نہیں میری آہ موئے ایسا نہیں کر سکتی'' آئرین نے بھڑک کر کہا ''وہ تو تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ نہیں کرتی اور اگر میں ایسا کرتی ہوں تو یہ سرسر میری اپنی مرضی ہوتی ہے۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ اس نے یہاں سے جانے کے بارے میں سوچا تھا۔''

آئرین کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔ ''اور یہ آہ موئے کی وجہ سے نہیں بلکہ میری ساس کی وجہ سے تھا جو ہمارے یہاں رہنے کے لئے آئی تھی اور پہلے دن سے ہی ہر ایک کے لیے

مصیبت کا باعث بن گئی تھی۔''

''وہ بڑھیا تو بس حد ہی کر دیتی تھی۔'' آ ئرین نے چیخ کر کہا ''وہ میری آ ہ موئے کی زندگی جہنم بنا دیتی تھی۔ ہمیشہ اس میں کیڑے نکالتی رہتی، اسے ڈانٹتی رہتی، اس کی جاسوسی کرتی رہتی اور آخر کار آ ہ موئے سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوسکا اور وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں جانا چاہتی ہوں۔ میں تو گھبرا گئی اور میں نے بڑھیا کی خوب خبر لی۔ اور تم جانتی ہو اس نے آ ہ موئے کو کیا کہا؟ ناگن! بڑھیا نے آ ہ موئے کو ناگن کہا اور مجھے اس سے خبردار رہنے کے لیے کہا اور پتہ نہیں کیا کیا بکتی رہی۔ اور اس دوران اس نے وہ تمام چینی محاورے اور فقرے استعمال کیے جنھیں سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے تو اسے چلی جانے کے لیے کہہ دیا۔ میں نے اپنے خاوند کے ساتھ بات کی اور یہی فیصلہ ہوا کہ بڑھیا کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ کہیں اور جا کر رہے۔ میری طرح میرے خاوند کا بھی آ ہ موئے کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ لیکن مجھے معلوم ہے آ ہ موئے کی آمد سے جو خوشگوار تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں انھیں وہ بہت پسند کرتا ہے۔ پہلے وہ بچوں کے بارے میں بڑبڑاتا رہتا تھا اور اسے کھانے کے بارے میں بھی شکایت رہتی تھی لیکن اب تو وہ ہمیشہ اچھے موڈ میں ہوتا ہے۔ آ ہ موئے کی برائی کرنے والی صرف وہ بڑھیا ہے لیکن اس کا ذکر ہی کیا۔'' اور آ ئرین اپنی ساس کے بارے میں اس سے زیادہ گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

ایک اتوار کو، جو آ ہ موئے کی چھٹی کا دن تھا، وہ آ ئرین کی درخواست پر اپنے گھر نہیں گئی کیوں کہ یہ دن وہ اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ ایک فیشن شو منعقد ہو رہا تھا اور اس کے بعد دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنی ایک ایسی ہم جماعت کے گھر جا رہی تھی جس نے ایک انتہائی امیر انڈونیشین کاروباری سے شادی کر رکھی تھی اور اب سنگاپور کے اعلیٰ ترین علاقے میں رہتی تھی۔

یُون نے بے حد فراخ دلی سے بچوں کو چڑیا گھر لے جانے کی حامی بھری تھی لیکن یہ تو زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کا کام تھا اس لیے بقیہ دن کے لیے اسے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آ ہ موئے کی ضرورت تھی۔

''خدا حافظ، میرے بچو۔ پھر ملیں گے۔'' آ ئرین نے خوش دلی سے دونوں بچوں کو چوما اور بچوں نے اس کی ذرہ برابر پروانہ کی۔ بڑا تو یہ دیکھ رہا تھا کہ چھوٹے کی کرسی کو کب تک

جھنجھوڑا اور دھکیلا جا سکتا ہے یہاں تک کہ وہ چیخیں مارنے لگے۔ چھوٹا یہ سوچ رہا تھا کہ کون سا لمحہ مناسب رہے گا جب وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگے اور سب لوگ دوڑے آئیں اور پوچھیں کہ اوہو، آپ کو کس نے مارا ہے؟ جلد ہی چیخیں بلند ہونے لگیں اور یہ اس کے ننھے منے جسم کی مناسبت سے کافی طاقت ور چیخیں تھیں۔ آہ موئے بھاگتی ہوئی آئی۔ آئرین نے کار میں سے مسکراتے ہوئے کہا:

''پیارے بچو، دیکھو اب جھگڑنا نہیں۔۔۔۔۔'' اور پھر کار کو تیزی سے چلاتی ہوئی چلی گئی۔ بون نے اتوار کے اخبار اور صبح کی کافی سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔''کینی تم ٹکی کو تنگ کرنا بند کر دو۔'' اور اس کے بعد پھر اخبار پر جھک گیا۔

چھوٹے بچے کو کرسی سے اٹھا کر آہ موئے نے اسے چمکارا اور پھر بڑے بچے کو جھوٹ موٹ تھپٹر مار کر صورت حال معمول پر لوٹائی۔ جلد ہی آہ موئے نے دونوں بچوں کو صاف ستھرا بنا کے فرش پر کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا۔

بون ابھی تک اخباروں میں محو تھا۔ آہ موئے ناشتے کی میز کے گرد منڈلاتی رہی۔ کبھی یہ اٹھا اور کبھی وہ شے صاف کر لیکن وہ کر کچھ نہیں رہی تھی۔ سادہ سوتی لباس اور میک اپ کے بغیر بھی آہ موئے خوش شکل لگ رہی تھی۔ انیس برس کی عمر میں اس کا جسم بھر چکا تھا اور اس کی جلد صحت اور جوانی سے دمکتی تھی۔ اس کے چہرے کا تاثر فرمانبرداری اور جھینپو پن کی بجائے ایک شرمیلے شعور میں بدل چکا تھا۔ آہ موئے کے گال سرخ ہوئے، اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

حالانکہ وہ اس وقت فرش کو دیکھ رہی تھی۔ وہ میز کے گرد منڈلاتی رہی اور اپنے مالک سے دریافت کرتی رہی کہ اسے اور کافی کی ضرورت تو نہیں۔ بون نے اوپر دیکھا، تھوڑا سا ہچکچایا اور پہلو بدل کر کہنے لگا: ''نہیں شکریہ'' اور پھر اخباروں میں گم ہو گیا۔ وہ کمرے میں پھرتی رہی۔ مکھن کی تھالی کو ایک طرف رکھا۔ ایک کانٹے کو قالین پر سے اٹھایا۔ الماری پر رکھے گلدان کے پھول دوبارہ ترتیب دیے۔ اگرچہ ان حرکات کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا لیکن تاڑنے والا تاڑ سکتا تھا کہ ہر حرکت جان بوجھ کر کی جا رہی ہے۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک اور جذبے کی ایسی شدت اس شخص کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی جس کے لیے وہ پیدا کی جا رہی ہو۔ وہ شخص بدھو ہو تو بھی اسے یہ احساس ہو کر رہے گا کہ یہ سب اسی کے لیے ہے۔ اور اگر وہ ایک بھرپور اور صحت مند مرد ہو اور پینتالیس برس کا ہونے کے باوجود زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ رکھتا ہو تو اس

پر ان حرکات کا انتہائی خوشگوار اثر ہو گا۔

بون اپنی کرسی پر سے اٹھا۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ بیک وقت خوش بھی ہوا تھا اور اس صورتِ حال کا چسکا بھی لے رہا تھا۔ کچھ عرصہ سے اس نے اس گھریلو ملازمہ کے چہرے کے تاثرات اور بولنے کے انداز میں ایک واضح تبدیلی محسوس کی تھی اور یہ تبھی ہوتا تھا جب وہ تنہا ہوتے تھے۔ یک دم اسے یاد آیا کہ ایک روز اس کی ماں نے اسے خبردار کیا تھا کہ آہ موئے ایک گہری خطرناک عورت ہے۔ اس کی گہرائی اور خطرناکی اسے بالکل پریشان نہیں کر رہی تھی اور وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ پینتالیس برس کی عمر میں جن تو ند نکل رہی ہو اور ماتھا پھیلتا جا رہا ہو تو ایک خوش شکل انیس سالہ لڑکی کا مائل ہونا یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم اب بھی دلکش ہیں۔ اگر چہ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ خوش تھا۔ اس سے اس کی انا کو تسکین ملی تھی۔ اسی لیے ایک دعوت میں جب ایک دوست نے کہا کہ ہم سب اب پچاس پیٹے میں ہیں اور وہ لفنگے نو جوان نہیں رہے جو کبھی تھے تو اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا: ''لیکن ایک بوڑھا شخص بھی تو نو جوان اور پیاری چیزوں کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ کم از کم میں تو یہ جانتا ہوں کہ میری انیس سالہ آہ موئے مجھے پیار بھری نظروں کے ساتھ تکتی رہتی ہے۔''

اس کی بیوی جو ساتھ والی ٹولی میں کھڑی تھی، فوراً اس کے پاس آ گئی تا کہ ہنسی مذاق میں شامل ہو سکے۔ وہ بڑے زبردست موڈ میں تھی اور آدھے گھنٹے تک اپنے گرد جمع ''خبیث بوڑھوں'' کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ وہ آہ موئے کو نوکری سے نکال دے گی اور آئندہ صرف ادھیڑ عمر ملازمہ رکھے گی جو موٹی ہو اور اس کی آواز کرخت اور بلند ہو اور دانت سونے کے ہوں۔ اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

اگر چہ بون اپنی بیوی کی پُر لطف باتوں پر مسکراتا رہا تھا لیکن ذاتی طور پر وہ کچھ متفکر تھا گو پریشان نہیں تھا۔ نو جوان لڑکی سینکڑوں حیلوں بہانوں سے اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوں اس کی انا کی تسکین ہوتی تھی۔ وہ بالکل فکر مند نہ تھا۔ یہ تو اس کے زندگی گزارنے کے طریقے کے عین مطابق تھا کہ آرام اور عیش سے اپنی انا کی تسکین کی جائے۔ ہر شام وہ اپنے کلینک سے ایک منافع بخش اور مصروف دن گزار کر واپس آتا تا کہ اس کی بیوی بچے اور آرام دہ گھر اسے راحت دیں۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو ہر لحاظ سے خوش تھا۔

آہموئے نے میز پر سے ناشتے کی چیزیں سمیٹتے ہوئے پوچھا اور اس دوران اس کا پورا وجود اس شخص کے چہرے اور آواز میں اپنے لیے اپنائیت تلاش کرتا رہا جسے دیکھ کر پہلے ہی دن وہ متاثر ہوئی تھی اور اب چوری چھپے اس کی پرستش کرتی تھی۔ ''چچی کیا کہہ کر گئی ہیں کہ بچے کتنے بجے چڑیا گھر جائیں گے، چچا؟'' وہ ہمیشہ اسے ''چچا'' کہہ کر مخاطب کرتی لیکن اسے صرف ڈاکٹر جان سمجھتی۔ اس کی بیوی کی موجودگی میں وہ کبھی اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ اس کا سوال اپنی تمام تر خفیہ علامتوں کے ساتھ اس پر ظاہر ہوا۔ دو گھنٹے وہ بلا روک ٹوک تنہا ہوں گے، بچے ہوں گے، چار سالہ کینی اور دو سالہ نکی اور چڑیا گھر کے جانور لیکن یہ پہلی بار ہوگا کہ وہ آئرین کے بغیر ہوں گے۔ اب مذاق مذاق نہیں رہا تھا۔ اس صورت حال میں کسی ایسی چیز کا اضافہ ہو چکا تھا جس کے بارے میں بون کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا ہے۔

آہموئے نے بچوں کو تیار کیا۔ پھر وہ کپڑے بدلنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور جونہی بون نے بات کی آہموئے اس کی آواز کی شدت سے جان گئی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ بات چیت انگریزی میں ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے اور بے چینی کے آثار ظاہر ہونے لگے کیوں کہ اسے خیال تھا فون کرنے والا اس کے مالک کو کہیں اور جانے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس نے بُون کو پُر اشتیاق لہجے میں ''ہاں ہاں'' کہتے سنا اور جونہی اس نے فون رکھا آہموئے کچھ جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے کہیں اور جانا پڑ گیا ہے۔'' اُس نے آہموئے سے نظریں چراتے ہوئے بے چینی سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ جب اُس نے نظریں اُٹھائیں تو اس نے دیکھا گلابی فراک میں وہ بہت دل کش دکھائی دے رہی تھی اور لباس کا رنگ اُس کی رنگت پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ اُس کی چمکتی آنکھیں مسکارا اور پنسل کے استعمال کی وجہ سے بہت خوبصورت ہو گئی تھیں۔ اُس کے بال گھنگھریالے تھے۔ وہ ایک بھرپور عورت تھی۔ وُہ اتنی ہی خوبصورت اور پرکشش لگ رہی تھی جتنی فیشن شو میں شرکت کرنے والی ماڈل لڑکیاں یا رسالوں کے سرورق پر چھپنے والی عورتیں ہوتی ہیں۔ آہموئے مسکرائی۔ بُون کپڑے بدلنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا اور تیار ہو کر چلا گیا۔ ہاں جانے سے پیشتر اُس نے کہا: ''مجھے افسوس ہے ہم چڑیا گھر نہیں جا سکے'' یہ اس نے اس طرح کہا جیسے صرف وہ دونوں ہی جا رہے تھے اور بچوں کا اس میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ آہموئے پھر مسکرائی اور کہنے لگی: ''کوئی بات نہیں۔'' لیکن مایوسی کو وہ پرچھائیں، جو اس کے

چہرے پر ایک لمحے کے لیے آئی، بُون نے دیکھ لی۔ وُہ آہستہ آہستہ چلتا گھر سے باہر گیا اور پھر کار میں بیٹھ گیا۔ وہ اَن چاہے خیالات اور محسوسات سے لبریز تھا!

جب وُہ تنہا رہ گئی تو اُس نے اُبلتے ہوئے غصے کا اظہار کُچھ یوں کیا کہ پہلے تو اُس نے سارے کپڑے اتار دیے اور اُنھیں فرش پر پھینک دیا۔ پھر ایک سُوتی چولا پہن کر اپنے بال ایک رسی سے باندھ لیے۔ پھر وُہ باورچی خانے میں کچھ پینے کے لیے گئی اور فرج کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا جیسے یہ سب اُسی کا قصور تھا کہ بُون اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو ایک صوفے پر گرا لیا۔ کوکا کولا کا ایک گلاس اُس کے ہاتھ میں تھا اور اُس کے ہونٹ مایوسی سے بھینچے ہوئے تھے۔ جب بڑا لڑکا کھیل ہی کھیل میں اُس کی طرف بھاگتا ہوا آیا اور کوکا کولا اُس پر گرا دیا تو اس نے اٹھ کر اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ لڑکا یک دم ٹھہر گیا اور خوفزدہ آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے رونے کی جُرأت بھی نہ کی۔ ''اپنے کمرے میں جاؤ اور خبردار جو بستر سے باہر آئے تو!'' اُس نے حکم دیا۔ لڑکے نے فوراً تعمیل کی۔ اس دوران چھوٹے نے پیشاب کر دیا تھا اور اپنے مُنہ میں ریت ڈال لی تھی۔ آہ موئے نے اُسے بھی ایک تھپڑ رسید کیا اور اُس کی ٹانگ پر چٹکی کاٹ لی اور پھر اُسے صاف کیا۔ وہ بے حد تھک گئی تھی۔ اب اُس کے غصے کا رخ آئرین کی طرف ہو گیا۔

''احمق نکمی عورت۔۔۔۔۔۔ ہمیشہ مجھے بچوں کے پاس چھوڑ کر نکل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اتوار کو بھی۔۔۔۔۔۔'' آہ موئے نے نفرت سے سوچا۔ ''اُس کا کیا خیال ہے کہ وہ مجھے زیادہ تنخواہ دے کر ہر کام کروا سکتی ہے۔''

وہ آئرین سے نفرت کرتی تھی۔ اسے نفرت تھی اُس کی دولت کی وجہ سے، اُس کی عزت کی وجہ سے، اُس کے خاوند کی وجہ سے۔ اُسے اُس کے بیکار اور فضول طریقوں سے نفرت تھی۔ آئرین کی یہ بات اسے ہمیشہ یاد رہے گی کہ اُس کی اور اُس کے بھائیوں کی ساری تنخواہ ملا کر بھی شام کا ایک لباس نہیں خریدا جا سکتا۔ اُس نے یہ فقرہ سُن لیا تھا اور اُسے یہ ہمیشہ یاد رہے گا کیوں کہ یہ سچ تھا۔ جب بھی آئرین کا بوڑھا باپ ملنے کے لیے آتا۔۔۔۔ وہ صاحب جائیداد اور بے حد امیر آدمی تھا۔ وُہ اُس کے لیے تحفے تحائف لاتا تھا اور اُس کے ساتھ بے حد محبت سے پیش آتا تھا۔ اس وقت آہ موئے کو اپنا باپ یاد آ جاتا جو اُسے پیٹا کرتا تھا اور اُس کے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے ایک نشان چھوڑ گیا تھا جو اُس کے بالوں کی ایک لٹ گرا کر چھپانا پڑتا تھا۔ آئرین کا

خاوند بھی اُس سے بے حد محبت کرتا تھا اور ہمیشہ اُس کو بے شمار پیسے دیتا تا کہ وُہ چیزیں خرید سکے یا ماہ جونگ کھیل سکے۔ آہ موئے نے انھیں کتنی مرتبہ دیکھا تھا جب اُن کے بیڈروم کا دروازہ اتفاقاً کھلا رہ گیا تھا۔ اور جس طرح خاوند اُسے چھیڑتا تھا اور پکڑتا تھا اور جس طرح وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی تھی اور اُس کے ساتھ کھیلتی تھی اس کو یاد ہے۔ وُہ شدید حسد میں مُبتلا ہو جاتی۔

کار کی آواز سُن کر آہ موئے تیزی سے اُٹھی، اُس نے کوکا کولا کا گلاس میز پر اور چھوٹے بچے کو کولہے پر رکھا اور بڑے بچے کو جلدی سے کمرے سے باہر لے آئی۔ وُہ پورا ایک منٹ بچوں کے ساتھ خوش خوش کھیلتی رہی تب بُون اندر آیا۔ وُہ کچھ شرمندہ سا تھا جب اُس نے کہا: ''میں اپنے دوست کو ملنے کے لیے نہیں جا رہا۔ وہ مصروف ہے۔ اب میں بچوں کو چڑیا گھر لے جا سکتا ہوں۔ ان کو تیار کر دو۔''

''بچو، چلو آؤ، اپنے جُوتے پہنو۔'' آہ موئے نے آہستہ سے کہا اور وُہ روشنی جو اُس نے رخساروں پر آئی اور وہ چمک جو اُس کی آنکھوں میں تھی چھپائے نہ چھپتی تھی۔ لڑکے اپنے بہترین کپڑوں میں تھے اور اُن کو رنگین بانکی ٹوپیاں پہنائی گئی تھیں۔ آہ موئے نے انھیں کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ جب کبھی سارا خاندان باہر جاتا تو ایسے ہی سب لوگ بیٹھتے۔ آئرین اور اُس کا خاوند انتظار کرتے اور وہ بچوں کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتی اور دوران سفر وہ ان کی ضروریات کا خیال رکھتی اور اُن کو بہلائے رکھتی۔ اب لڑکوں نے لڑنا شروع کر دیا اور بڑے نے چھوٹے کو تھپڑ مار دیا۔ باپ نے سختی سے کہا: ''کینی تم بڑے شرارتی ہو۔ تم پیچھے بیٹھو گے اور آہ موئے نکی کو لے کر اگلی سیٹ پر بیٹھے گی۔'' آہ موئے کے چہرے پر ایک نرم روشنی پھیلی جس سے وہ اور بھی زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ اس نے بڑی فرمانبرداری سے بچے کو اُٹھایا اور اگلی سیٹ پر براجمان ہوئی۔

''اب ہم تیار ہیں۔'' ڈاکٹر چان نے ذرا مسخرے پن سے کہا اور کار چلا دی۔

آئرین، جس نے پچھلے چھ مہینوں میں پندرہ پونڈ وزن کم کیا تھا کیوں کہ میک اپ اُس کے چہرے کی جھریوں اور چھائیوں کو چھپانے میں ناکام رہا تھا، اُس کی سہیلی بی لنگ نے اُسے گرم گرم چائے یا کافی پینے کے لیے کہا کیوں کہ وُہ بہت بے چین لگ رہی تھی اور اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''نہیں نہیں۔ شکریہ لنگ ـ ـ ـ ـ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اُس نے کہا۔ ''میں صرف

تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں تا کہ اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ اگر میں نے کسی سے بات نہ کی تو میں چیخنے لگوں گی اور پاگل ہو جاؤں گی۔ کس کو یقین آ سکتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے۔ لِنگ۔۔۔۔۔ اور میرے ساتھ؟ جیسا کہ میں نے شروع میں تمھیں بتایا تھا میں نے اُسے نوکری سے نکال دیا تھا۔ سامنے رہنے والی مسز لائی کے الزامات میں برداشت نہ کرسکی تھی اور ظاہر ہے کہ اس میں کچھ تو سچ ہوگا ورنہ وُہ ایسا کیوں کرتی؟ اُس نے مُجھ سے کہا تھا کہ میں نے تمھارے خاوند کو معمول سے پہلے آتے دیکھا۔ وہ عام طور پر تو ایسا نہیں کرتا؟ اور اُسی سانس میں اُس نے کہا تھا کہ تمھاری آہ موئے کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی ہے۔ وُہ خوب میک اپ کرتی ہے اور بڑی خوبصورت لگتی ہے۔ میں نے بعد میں یُون سے پُوچھا اور بہت ہی سرسری انداز میں کہ وُہ کلینک سے اتنی جلدی کیوں آ گیا ہے حالانکہ یہ اس کا معمول تو نہیں ہے تو وہ کہنے لگا کہ وہ کچھ بُھول گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تم نے وہ چیز لانے کے لیے احمد کو بھیج دیا ہوتا تو وہ لا جواب سا ہو گیا۔ میں نے زیادہ پُوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی تو وہ بے چین ہو گیا۔ میں اُن دونوں پر نظر رکھ رہی تھی لیکن میرا خیال ہے لڑکی بہت چالاک تھی اور وُہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی۔ جو کُچھ مجھے کینی نے بتایا وُہ تو آخری تنکا ثابت ہوا۔ تم جانتی ہو کہ میرا کینی کتنا سمجھدار اور ہوشیار بچہ ہے! وہ اپنی ریل گاڑی کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے یک دم کہنے لگا: ''ڈیڈی کو چاچا سے پیار ہے۔'' یا اسی قسم کا کوئی فقرہ۔ میں نے فوراً اُس سے پوچھا کہ اس نے یہ کیا کہا تھا تو وُہ کُچھ خوفزدہ اور دل برداشتہ سا ہو گیا اور سر ہلانے لگا۔ ظاہر ہے اُس کو دھمکیاں دی گئی تھی اور اُس کے دماغ میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ اُس نے کسی کو کُچھ نہیں بتانا۔ میں نے اُسے بہتیرا بہلایا پھسلایا، اُکسایا اور خوفزدہ کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کینی چھوٹا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ لِنگ اس صورت حال کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ اتنے عرصے میں وہ چھنال میرے ٹبر پر اثر انداز ہو رہی ہے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ایسی فرینی! اور تم نے تو اُسے دیکھا ہے، کیسی کم عمر، نرم اور معصوم نظر آتی ہے۔ میں نے تو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سبق سیکھ لیا ہے۔ میں نے اُسے نوکری سے نکالتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ میں نے اپنی ملازمت چھوڑ دی ہے اس لیے مجھے اب اُس کی ضرورت نہیں رہی۔ تم ذرا اُس کا چہرہ دیکھتیں۔ اُس پر میرے لیے کتنی نفرت اور حقارت تھی۔ بالآخر وُہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گئی۔ میں نے اُسے ایک ماہ کی تنخواہ زیادہ ادا کر دی تا کہ اُس کے پاس شور مچانے کا جواز باقی نہ رہے۔ اُس کے بھائی کچھ بدمعاش سے لگتے ہیں۔''

آ ئرین یہ بھید صرف بی لنگ کو بتانا چاہتی تھی لیکن دل اور دماغ کا غبار ہلکا کرنے کے لیے اُس نے دھوکے باز اور فریبی ملازمہ کے بارے میں اُسی زور شور سے بولنا شروع کر دیا جس طرح کسی زمانے میں وہ اُس کی خوبیاں بیان کیا کرتی تھی۔ اُسے اب وہ تمام چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آ رہے تھے جو اُس لڑکی کے فریب اور چالاکی کا ثبوت تھے۔

''بظاہر وہ میرے بچوں کے ساتھ بڑی محبت جتاتی تھی۔'' آ ئرین نے کہا۔ ''شکوہ شکایت کئے بغیر وُہ اُن کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ اور یہ سراسر ایک ڈھونگ تھا تا کہ وہ اس کے بغیر رہ ہی نہ سکیں۔ اور ہر بار مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ ملازمت نہ چھوڑ جائے اور میں اس کی تنخواہ بڑھا دیتی۔''

آ ئرین کے لیے اس گہری چال کا بھلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ ''وہ میرے سامنے کتنی اچھی، خوش مزاج اور جی جان سے خدمت کرنے والی نظر آتی تھی لیکن میری پیٹھ پیچھے اس دوران میں سارا وقت وہ مجھ سے میرا خاوند چھین لینے کے منصوبے بناتی رہی اور میرے بچوں پر ظلم ڈھاتی رہی کہ وہ بول نہ سکیں۔'' بے اختیار ہو کر وہ چلانے لگی۔

''ایسی سنگ دل اور بے حس! اور میں نے اُس کے لیے کیا نہیں کیا؟ اسے تحفے دیے، اس کی خبر گیری کی، اس کے گھر والوں کو تحفوں سے نوازا۔ کوئی یقین کر سکتا ہے کہ اس دنیا میں ایسے ناشکرے بھی رہتے ہیں۔''

''میری ساس درست ہی کہتی تھی'' آ ئرین نے انتہائی بے چارگی سے کہا، ''اس نے مجھے بروقت خبردار کیا تھا کہ آ ہ موئے ناگن ہے۔ لیکن میں اتنی اندھی ہو چکی تھی کہ میں نے اُس کی بات کا اعتبار نہ کیا اور اُس کے ساتھ لڑائی کر لی۔ میرے گھر میں ایک ناگن تھی اور میں اُس کے وجود کے بارے میں لاعلم رہی۔ یہ بوڑھے لوگ اُن چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں جن پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ لنگ، میں تو ہر شے سے تنگ آ گئی ہوں۔''

اُس کی سہیلیوں نے اُس کی دل جوئی کی اور یاد دلایا کہ جس نے مصیبت کھڑی کی تھی اُسے تو رخصت کر دیا گیا ہے اور ایک مرتبہ پھر سکون اور امن کا دور دورہ ہے اس لیے اب بے چین ہونے یا اُس کے بارے میں باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔۔

''مجھے کچھ یقین نہیں ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا سوچوں لنگ۔'' آ ئرین نے بے چارگی سے کہا ''میرا خاوند۔۔۔وُہ اب اتنا بدل چکا ہے۔ وہ اب بھی

میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے اور وُہ لڑکوں کے لیے ایک اچھا باپ بھی ہے اور ہر شے معمول کے مطابق چل رہی ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کچھ ہے جو درست نہیں ہے اور جسے میں صرف محسوس کرسکتی ہوں لِنگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا خاوند اندر سے، دل سے وہ نہیں جو پہلے تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وُہ مجھ سے کُچھ چھپا رہا ہے لیکن میں اس کے بارے میں اس کے ساتھ گفتگو نہیں کرسکتی کیوں کہ وہ موضوع بدل دیتا ہے اور جب میں زور دے کر پوچھتی ہوں تو وہ ناراض ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں میں نے اُس ناگن کو کیوں اپنے گھر میں رکھا جس نے میرے گھر کو مصیبتوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔''

آ ئرین جب اگلی مرتبہ بی لِنگ سے ملی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''میرا خیال ہے میرے خاوند نے اُسے داشتہ بنالیا ہے۔'' اُس نے افسوس اور تلخی کے ملے جُلے جذبات سے کہا۔ ''میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔'' وُہ کہتی گئی۔ ''وہ بہت بدل چکا ہے اور اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا ہے اور اُس کے پاس ہر وقت بہت مناسب بہانے ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے میں نے اُسے کلینک میں فون کیا تو کسی نے بتایا کہ وہ گھر جاچکا ہے۔ وہ پورے دو گھنٹے کے بعد گھر آیا۔ جب میں نے دریافت کیا تو کہنے لگا کہ اگلے ماہ منیلا میں ہونے والی کانفرنس کے لیے کچھ چیزیں خریدنے کے لیے کسی دکان میں رک گیا تھا۔ اور میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے ہاتھوں میں کچھ بھی نہیں! اب تو میں سوچتی ہوں کہ یہ کانفرنس بھی چند روز کے لیے یہاں سے چلے جانے کا ایک بہانہ ہے۔''

''کیا فضول بک رہی ہو۔ تم جانتی ہو یہ سالانہ میڈیکل کانفرنس ہے اور میرا خاوند بھی جارہا ہے۔'' بی لِنگ بولی۔

''اور پچھلی جمعرات کو، لِنگ ۔ ۔ ۔ ۔'' آ ئرین کہہ رہی تھی۔ ''تقریباً نو بجے فون کی گھنٹی بجی اور جب میں نے چونگا اُٹھایا اور ہیلو کہا تو فون یک دم بند ہوگیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہی ناگن ہوگی۔ اس کا خیال ہوگا اس وقت صرف یُون گھر پر ہوگا کیوں کہ جمعرات کو میں ماہ جونگ کھیلنے جاتی ہوں اور وُہ اس بات سے آگاہ ہے۔ اور کل تو میں نے خود اُسے دیکھا تھا۔ لِنگ وُہ میٹرو بلڈنگ کے خودکار زینے پر تھی، خوب بنی ٹھنی ہوئی بالکل کسی امیر داشتہ کی طرح۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ لِنگ تم بتاؤ کیا سچ مچ میرے خاوند کے اُس کے ساتھ تعلقات ہیں؟'' اور پھر آ ئرین پھوٹ پڑی اور رونے لگی۔

''میں آج رات اُس کے ساتھ بات کروں گی اور بس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ معاملہ آج ہی ختم ہو جائے گا۔'' اُس نے بڑے اعتماد سے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ خاوند نے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور کہنے لگا: ''کیا تم پاگل ہو؟ تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' اور وُہ اتنا معصوم اور حیران نظر آ رہا تھا کہ ایک لمحے کے لیے اسے اس کی بے گناہی کا یقین آ ہی چلا تھا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔ کیوں کہ اُس نے اُس کے چہرے پر سے کچھ گزرتے دیکھ لیا۔ اُس نے دیکھا کہ چند لمحوں کے لیے اُس کے چہرے پر جرم کی ایک پرچھائی تیر گئی تھی اور اُس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا کر ان تاثرات کو حیرت اور معصومیت میں بدل لیا تھا۔

''جانِ من یہ فضول باتیں بند کر دو نا۔۔۔۔۔۔'' اُس نے دکھاوے کے ہلکے پھلکے اور مزاحیہ انداز میں کہا۔ وُہ فریب کے اس جالے میں، جو اُس کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا، وہ بے حد اداس تھی!
